نومبر ۱۹۸۹ء

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	عاکف سعید	۲
نوعِ انسانی کا واحد اور آخری سہارا: قرآن حکیم	ڈاکٹر اسرار احمد	۳
ہدایت القرآن (۳۴)	مولانا محمد تقی امینی	۷
کاروانِ حدیث (۵)	عبدالرشید عراقی	۱۳
جنوبی ہند کی ایک نادر تفسیر (۲)	مولانا اخلاق حسین قاسمی	۱۸
نقطۂ نظر (صدق اللہ العظیم)	مولانا عبدالرؤف	۲۷
اہلِ بیت کون ہے	محمد سعید الرحمٰن علوی	۳۳
لغات و اعرابِ قرآن (۸)	پروفیسر حافظ احمد یار	۴۱
حکمتِ اقبال (۲۰)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۵۷
اسلام کا معاشی نظام (بسلسلہ ڈاکٹر طاہر سعید کے نام)	ڈاکٹر حافظ محمد مقصود	۶۳

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد کی جامع تالیف

مسلمانوں پر

قرآن مجید کے حقوق

خود پڑھیے اور دوستوں اور عزیزوں کو تحفۃً پیش کیجیے

نوٹ

اس کتابچے کا انگریزی، عربی، فارسی اور سندھی زبان میں بھی ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ اس کے حقوق اشاعت بذریعہ ڈاکٹر صاحب کے حق میں محفوظ ہیں نہ انجمن کے

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور

۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ فون: ۸۵۶۰۰۴

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

(البقرہ ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدّین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

معاون امورِ انتظامی: حافظ خالد محمود خضر

جلد ۸ | نومبر ۱۹۸۹ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ | شمارہ: ۱۱

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶- کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴- فون: ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس: اا داؤد منزل متصل شاہ بخیری۔ شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون ۴۰/- روپے فی شمارہ ۴/- روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرفِ اول

لغات و اعراب قرآن کے نام سے پروفیسر حافظ احمد یار صاحب کی بلند پایہ تالیف کی قسط وار اشاعت کا آغاز جنوری ۱۹۸۹ء سے ہوا تھا۔ قارئینِ کرام کے علم میں ہے کہ محترم حافظ صاحب نے خدمتِ قرآنی کے اِس عظیم کام کا آغاز اواخر ۱۹۸۸ء میں کیا تھا۔ اور اس کی ضرورت کا احساس انہیں قرآن اکیڈمی کی دوسالہ کلاس میں ترجمۂ قرآن کی تدریس کے دوران ہوا۔ پھر رمضان المبارک کے دوران جامع القرآن، قرآن اکیڈمی میں نمازِ تراویح کے ساتھ ساتھ ترجمۂ قرآن کے شبینہ پروگراموں نے اُن کے رہوارِ شوق کو مزید ہوا دی کہ لغت اور اعراب کی تفصیلی بحث کے ساتھ قرآن حکیم کے الفاظ کا ترجمہ اگر اُردو زبان میں کر دیا جائے تو طالبانِ قرآن کے لیے بہت سہولت ہو جائے گی اور فہمِ قرآن اور ترجمہ و بیانِ قرآن کی راہ کی بہت سی رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ چنانچہ حافظ صاحب نے اپنی پیرانہ سالی کے باوصف اللہ کی نصرت و تائید کے بھروسے پر اِس گرانقدر علمی منصوبے پر کام کا آغاز کر دیا اور لغت اور اعراب کی بحث کے ساتھ ساتھ اپنے ذوق کے مطابق 'رسم' اور 'ضبط' کی بحث کو بھی شاملِ تالیف کر لیا جس کے باعث بلاشبہ اِس کاوش کی علمی افادیت کئی چند ہو گئی ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اُردو زبان میں اپنی نوعیت کا یہ منفرد کام ہے۔

محترم حافظ صاحب نے اپنے حلقۂ احباب میں متعدّد بار اِن جذبات کا اظہار کیا ہے کہ انہیں اِس سلسلے میں نہ کسی صلے کی تمنا ہے نہ ستائش کی پرواہ، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ وہ خدمتِ قرآنی کے جذبے سے جس درجے سرشار ہو کر اِس کتاب کی تالیف میں منہمک ہیں اُس پر یہ مصرعہ صادق آتا ہے کہ "جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے"۔ تاہم وہ اس بات کے شدّت سے متمنّی ہیں کہ اصحابِ علم اُن کی اِس کاوش پر بغور تنقیدی نگاہ ڈالیں، کوئی بات غلط محسوس ہو تو نشاندہی کریں، حافظ صاحب اُن کے ممنونِ احسان ہوں گے، اسی طرح اگر اسے مزید بہتر بنانے کے سلسلے میں کوئی صاحب اپنے ذہن میں کوئی تجویز رکھتے ہوں تو ضرور دیں، حافظ صاحب اس کا خیر مقدم کریں گے، تاکہ ابتدائی مرحلے ہی میں اس کام کو امکانی حد تک خامیوں سے پاک اور ممکنہ حد تک بہتر بنایا جا سکے۔ قارئینِ حکمتِ قرآن میں یقیناً اصحابِ علم و فضل کی کمی نہیں ہے ہمیں توقع ہے کہ محترم حافظ صاحب کی یہ اپیل صدائے بازگشت کی مانند تنہا واپس نہیں لوٹے گی۔

نشری تقریر

ڈاکٹر اسرار احمد

نوعِ انسانی کا واحد اور آخری سہارا

قرآنِ حکیم

ہر باشعور انسان جانتا ہے کہ انسانی شخصیت دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ ایک[1] فکر اور دوسرے[2] عمل۔ اور ان دونوں کے مابین رابطہ یا LINK کا کام دیتی ہے قوتِ ارادی، چنانچہ اگر انسان کی فکر درست ہو اور ساتھ ہی قوتِ ارادی بھی مضبوط ہو تو عمل بھی لازماً درست ہو جائے گا۔ لیکن اگر قوتِ ارادی کمزور اور مضمحل ہو تو فکر اور عمل کا رابطہ بھی کمزور پڑ جائے گا اور فکر کی درستی بھی عمل کی صحت پر منتج نہ ہو سکے گی اور صورت وہ ہو گی جو غالبؔ نے اپنے اس شعر میں بیان کی ہے کہ ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد　　پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

بصورتِ دیگر اگر فکر ہی غلط اور کج ہو تو انسان کا عمل لازماً غلط ہو گا، بالکل اس شعر کے مصداق کہ ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج　　تا ثریّا می رود دیوار کج

یا اس شعر کے مصداق کہ ؎

ترسم کہ بہ کعبہ نہ رسی اے اعرابی　　کیں راہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

ایسی صورت میں قوتِ ارادی کے ضعیف و مضمحل یا توانا و صحت مند ہونے کا اثر صرف کجروی کی رفتار پر ہی پڑ سکتا ہے۔ گویا اس صورت میں انسان کی کمزور قوتِ ارادی اس کے حق میں مآلِ کار کے اعتبار سے مفید ہی رہے گی کہ غلط راہوں پر اس کی پیش قدمی سُست رفتاری سے ہو گی۔

اب اگر آسمانی وحی سے قطع نظر انسانی فکر کا فی نفسہٖ جائزہ لیا جائے تو نظر آتا ہے کہ دو چیزیں اس کے لیے تانے بانے کی حیثیت رکھتی ہیں: ایک[1] حواسِ ظاہری سے حاصل شدہ معلومات اور اس کی ترتیب و تدوین اور اس طرح حاصل شدہ SENSE - DATA کی PROCESSING پر

مستزاد استدلال و استنباط جس میں استخراجی منطق (DEDUCTIVE LOGIC) استعمال ہوتی ہے اور دوسرے وہ منطقِ خالص جسے چاہیں تو استقراء (INDUCTION) سے تعبیر کرلیں جو عظیم تر اور وسیع تر حقائق سے نتائج اخذ کرتی ہے اور ایک جامع اور گمبھیر فکر کا ہیولیٰ تیار کرتی ہے۔ اس دوسرے جزو میں لامحالہ کچھ حصّہ انسان کے وجدان (INTUTION) کا بھی شامل ہوجاتا ہے۔

اب فکرِ انسانی کے ان دونوں اجزائے ترکیبی کا جائزہ لیا جائے تو ان میں سے پہلا تو نہایت محدود بھی ہے اور مسلسل ترقی پذیر بھی۔ چنانچہ آج سے دو ہزار سال قبل کے انسان کا SENSE - DATA بہت مختصر تھا آج کے انسان کے SENSE-DATA کے وسیع و عریض ذخیرے کے مقابلے میں، تاہم آج بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کامل ہوگیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آج سے چند سو سال بعد کا انسان آج کے انسان کے ذخیرۂ معلومات پر زہرِ خند کے ساتھ تحقیر آمیز تبصرہ کرے۔ رہا جزوِ ثانی تو وہ اگرچہ بظاہر پہلے کی نسبت وسیع تر ہے اور کسی قدر آزاد فضاؤں میں جولانیاں دکھاتا نظر آتا ہے، تاہم ذرا دقّتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنی اصل کے اعتبار سے پہلے ہی سے بندھا ہوا ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ فکرِ انسانی فی نفسہٖ کبھی بھی کامل نہیں ہوسکتی اور محض اس پر مبنی عمل لامحالہ محدود بھی رہے گا اور کج ہونے کے خطرہ سے بھی کبھی بالکلیہ آزاد نہ ہوسکے گا۔ اور اجتماعی سطح پر اس کے نتیجے میں انسان کے حصّہ میں یا TRIAL & ERROR کی ٹامک ٹوئیاں آئیں گی EXTREMES یعنی افراط و تفریط کے دھکے۔

کامل فکر تو ظاہر ہے کہ صرف اُس ہستی کا ہوسکتا ہے جس کا علم کامل ہو اور نہ صرف ظاہر و باطن اور غیب و شہود سب پر حاوی ہو بلکہ ماضی، حال اور مستقبل یعنی 'ما کان' اور 'مایکون' سب کا احاطہ کیے ہوئے ہو۔ پھر اس علمِ کامل پر مستزاد اس کی حکمت بھی ہر پہلو سے کامل ہو۔ ایسی ہستی ظاہر ہے کہ صرف ایک ہی ہوسکتی ہے۔ اور وہ ہے اللہ تبارک و تعالیٰ جو "عالم الغیب والشہادۃ" بھی ہے اور "بکلِّ شئٍ علیم" بھی۔ اور ساتھ ہی حکمتِ کاملہ و بالغہ سے بھی متصف ہے۔ گویا فکرِ انسانی ہمیشہ محتاج رہے گی اُس ہستی کامل العلم والحکمۃ کی رہنمائی کی، جسے قرآنی اصطلاح میں "ہدایت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اگر ہم سورۃ البقرۃ کے چوتھے رکوع کے مضامین پر غور کریں جو فلسفہ و حکمت قرآنی کی اساسات کی تعیین میں منفرد اہمیت کا حامل ہے تو یہ دلچسپ صورت نظر آتی ہے کہ فرشتوں کی جانب سے پیش شدہ اشکال کو رفع کرنے کے ضمن میں آدم کے خلافتِ ارضی کی اہلیت کی دلیل کے طور پر تو پیش کیا گیا "علم الاسماء" کو۔ اور پھر جب آخر میں پروانۂ خلافت کے ساتھ اترنے اور بالفعل زمین کا چارج لینے کا حکم دیا گیا تو ساتھ ہی اس چارٹر کا اعلان بھی کر دیا گیا کہ :

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

یعنی "پھر جب بھی میری جانب سے تمہارے لیے ہدایت پہنچے تو جو اس کی پیروی کرے گا اس پر نہ کوئی خوف ہوگا، نہ وہ رنج و غم سے دوچار ہوں گے۔ اور جو انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے تو وہ ہوں گے آگ والے جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے"

اب ظاہر ہے کہ "علم الاسماء" سے مراد ہیں مادی اور طبعی علوم جو بالقوّہ یعنی POTENTIALLY ودیعت کر دیئے گئے تھے آدم کی سرشت میں اور جن کا ظہور یا EXFOLIATION ہے کُل کا کُل سائنسی اور تکنیکی علم۔ اور سلسلۂ ہدایت سے مراد ہے سلسلۂ وحی، سلسلۂ انبیاء و رسل اور سلسلۂ کتبِ سماویہ۔ جس کی آخری اور کامل کڑی ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن حکیم۔ بقولِ علامہ اقبال مرحوم و مغفور۔

نوعِ انساں را پیامِ آخریں حاملِ اُو رحمۃٌ للعٰلمین

قرآن حکیم نے سورۃ المائدہ میں تورات اور انجیل دونوں کے بارے میں فرمایا ہے: "فیہِ ھُدیً و نورٌ" یعنی ان میں ہدایت بھی تھی اور روشنی بھی لیکن قرآن اپنے آپ کو تعبیر فرماتا ہے۔ "الھُدیٰ" اور "النور" کے الفاظ سے یعنی ہدایتِ کاملہ اور نورِ کامل۔ اس میں اشارہ ہے اس حقیقت کی طرف کہ جب تک انسان بحیثیتِ مجموعی عقلی اور شعوری اعتبار سے بلوغ کو نہ پہنچا تھا اسے درمیانی عرصے یعنی INTERIM PERIOD کے لیے ہدایات یعنی COMMANDMENTS دی جاتی رہیں لیکن جب نسلِ آدم عقلی اور شعوری اعتبار سے سنِ شعور

کو پہنچ گئی بقول علامہ اقبال ؎ "جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر!" تو اسے آخری اور کامل ہدایت نامہ دے دیا گیا اور وہ ہے ہدایتِ کاملہ یعنی "الھُدٰی" اور نورِ کامل یعنی "النّور"۔ یہی وجہ ہے کہ بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام سے کل چھ سو سال قبل حضرت مسیح علیٰ نبیّنا و علیہ الصّلوٰۃ والسّلام اپنے حواریّین سے یہ فرماتے نظر آتے ہیں کہ "مجھے ابھی تم سے اور بہت کچھ کہنا تھا، لیکن ابھی تم اس کا تحمل نہیں کر سکو گے۔ البتّہ میرے بعد جو آئینگے وہ تمہیں ساری باتیں بتا دیں گے!" —— چنانچہ جب محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپؐ نے قرآن پیش کیا تو اس دعویٰ کے ساتھ کہ:

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (یونس : ۳۷)

مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَىْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (یوسف: ۱۱۱)

یعنی - یہ قرآن ایسی کتاب ہے ہی نہیں جسے اللہ کے سوا کوئی اور تصنیف کر سکے۔ بلکہ یہ تو ایک جانب سابقہ کُتب کی تصدیق کرتی ہے اور دوسری جانب ان پیشینگوئیوں کی مصداق بن کر آئی ہے جو ان میں وارد ہوتی تھیں۔ اور اس میں کتاب و شریعت کی کل تفصیل درج ہے اور یہ اہل ایمان کے حق میں ہدایت بھی ہے اور رحمت بھی!

گویا اب تا قیامِ قیامت فکرِ انسانی کو زیغ اور کجی سے بچانے کے لیے واحد سہارا قرآنِ حکیم ہے۔ واضح رہے کہ قرآن اپنے آپ کو "الذکر" بھی قرار دیتا ہے۔ اس اعتبار سے علامہ اقبال مرحوم و مغفور کے یہ اشعار بہت قابلِ توجہ ہیں:

جز بہ قرآں ضیغمی روباہی است — فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است
فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر — فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر!

یعنی فکرِ انسانی اُس وقت تک صحیح رُخ پر آگے نہیں بڑھ سکتی جب تک کہ وہ "الذکر" یعنی قرآنِ حکیم سے مسلسل رہنمائی نہ لیتی رہے!

مولانا محمد تقی امینی

اُمّتِ مسلمہ کی عالمی قیادت کے لیے چند بنیادی انتظامات

(۹) حلال و پاکیزہ چیزوں کے کھانے کا حکم

اللہ کی ہدایت میں غذا کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی بنا پر توحید و شرک کے بعد اس کا ذکر ہے۔ غذا جس قدر حلال و پاکیزہ ہوتی ہے اسی قدر انسان کے گوشت و خون اور اس کے فکر و عمل میں صفائی و ستھرائی پیدا ہوتی ہے اور جس قدر غذا حرام و گندی ہوتی ہے اسی قدر گوشت و خون اور فکر و عمل میں کدورت و خرابی پیدا ہوتی ہے۔ قرآن و حدیث میں مختلف انداز سے حلال و پاکیزہ غذا کی طرف رغبت دلائی گئی ہے اور حرام و گندی غذا سے نفرت دلائی گئی ہے۔ چنانچہ نیچے کی آیتوں میں گوشت و خون اور فکر و عمل ہر ایک میں خرابی و کدورت سرایت کر جانے کا ذکر ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝ وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ۚ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ۝ (البقرۃ: ۱۶۷-۱۷۱)

اے لوگو! زمین میں جو حلال و پاکیزہ چیزیں ہیں ان میں سے کھاؤ اور شیطان کے قدم بقدم نہ چلو۔ بیشک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ وہ تو تمہیں ہر قسم کی برائی اور بے حیائی کا حکم دیگا اور اللہ کے ذمہ ایسی باتیں لگانے کو کہیگا جس کا تمہیں علم

نہیں لے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس حکم کی پیروی کرو جو اللہ نے اتارا ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم اس بات کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ سمجھتے نہ ہوں اور اگرچہ وہ سیدھی راہ پر نہ ہوں! لے ان کافروں کی حالت بالکل اُن جانوروں جیسی ہے جن کو چرواہا پکارتا ہے اور وہ آواز و پکار کے علاوہ کچھ نہیں سنتے ہیں۔ وہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں، کچھ نہیں سمجھتے ہیں لے

لے یہ بات تمام انسانوں سے کہی جا رہی ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ خود اور اس کی نسل صاف ستھری ہو، جبکہ حرام و گندی غذا سے نہ صرف کھانے والے پر اس کا اثر پڑتا ہے بلکہ اس کی نسل بھی محفوظ نہیں رہتی ہے۔

حلال و پاکیزہ وہ چیزیں ہیں جن کو اللہ نے حلال کیا ہوا ور جائز طریقہ سے وہ حاصل بھی کی گئی ہوں۔ شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے، وہ کھانے پینے کی چیزوں میں ہزار طرح سے ملاوٹ کر دیتا ہے، بہت سی حرام چیزوں کو حلال اور حلال کو حرام بنا دیتا ہے۔ اسی طرح حلال کو ناجائز طریقہ سے حاصل کر لے کے اس کو گندی کر دیتا ہے اور انسان شیطان کی چالبازیوں سے واقف نہیں ہو پاتا ہے۔ بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان شیطان کی چالبازیوں کو اللہ کی طرف سے سمجھ کر ان کو مقدس اور پاک جاننے لگتا ہے۔

حرام و گندی چیزوں کو استعمال کرنے کے نقصانات چونکہ صرف اخلاقی و روحانی نہیں ہوتے ہیں، بلکہ جسمانی و مادی بھی ہوتے ہیں، اسی طرح یہ نقصانات صرف استعمال کرنے والے کی ذات تک نہیں رہتے ہیں بلکہ اس کی آل اولاد اور نسل تک میں سرایت کرتے ہیں، اس بنا پر شیطان کی توجہ حرام کو حلال بتانے اور گندی کو پاکیزہ دکھانے میں زیادہ صرف ہوتی ہے اور غالباً قرآن مجید میں "سُوءٌ اور فحشاء" کے دو لفظ اسی لیے لائے گئے ہیں تاکہ یہ دونوں ہر قسم کے نقصان کو سمیٹ لیں۔ قرآن میں لفظ "سُوء" کا استعمال جس طرح اخلاقی و روحانی بیماری کے لیے ہوا ہے اسی طرح جسمانی بیماری و مادی نقصان کے لیے بھی ہوا ہے، جبکہ "فحشاء" کا استعمال بڑی بڑی اخلاقی و روحانی بیماریوں کے لیے ہوا ہے۔ یہ دونوں لفظ حرام و گندی چیزوں کے استعمال کرنے کے

نقصانات بیان کرنے میں نہایت جامع ہیں ۔ انسان کا حرام و گندی غذا پر لگنا ہی شیطان کی برائیوں اور بیحیائیوں کی طرف دعوت قبول کرنا اور اپنے نقصان پر آمادہ ہونا ہے، خواہ یہ نقصان جسمانی و روحانی ہو یا اخلاقی و مادی ہو۔ یہ نقصان عام لوگوں کو اگرچہ نظر نہیں آتا ہے لیکن ان کی نظر سے دور نہیں ہے جو حرام اور گندی غذا سے پلے ہوئے گوشت و خون کی ریسرچ و تحقیق کرتے ہیں اور ان کو کھانے والے کی ذات ہی میں نہیں بلکہ اس کی آل اولاد اور نسل تک میں نقصان دکھائی دیتے ہیں۔

۲۔ شیطان کبھی تو دل میں بات ڈال کر براہ راست گمراہ کرتا ہے اور کبھی گمراہی و غلط کام پر لگانے کے لیے باپ دادا کو استعمال کرتا ہے یعنی اللہ کے حکم کے مقابلہ میں خاندانی رسم و رواج اور شرک و بدعت کی باتوں کی پیروی کراتا ہے اور سب سے بڑی سند یہ ہوتی ہے کہ خاندان میں یہی ہوتا آیا ہے، باپ دادا یہی کرتے آئے ہیں۔ اگر یہ باتیں غلط اور گمراہی کی ہوتیں تو یہ لوگ کیوں کرتے ؟ قرآن نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اگرچہ باپ دادا سمجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت و رہنمائی ان کے سامنے نہ ہو جب بھی یہ لوگ ان کی پیروی کریں گے ؟ یعنی کسی کی پیروی کے لیے دو باتوں کی ضرورت ہے (۱) سمجھ بوجھ اور (۲) ہدایت و رہنمائی۔ اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں تو پھر کس بنیاد پر انکی پیروی کی جائے گی ؟

یہ عجیب بات ہے کہ دین کی باتوں ہی میں باپ دادا کی پیروی کی جاتی ہے، دنیا کی باتوں میں نہیں ! جس عقل سے دنیاوی معاملات میں کام لیا جاتا ہے دین کی باتوں میں وہ عقل استعمال نہیں ہوتی ہے۔ ایسا بہت دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص دنیا کے کاموں میں بہت ہوشیار ہوتا ہے لیکن دین کے کاموں میں عقل کا استعمال گناہ سمجھتا اور بغیر سمجھ بوجھ پچھلوں کی نقل کرتا رہتا ہے۔ ایسی حالت میں ہر ایک کی پیروی کیسے درست ہو سکتی ہے ؟ پیروی اُسی کی درست ہوگی جس کے پاس سمجھ بوجھ بھی ہو اور ہدایت و رہنمائی بھی ہو۔ اگر دونوں میں سے ایک بھی نہ ہو تو وہ اس قابل نہ ہوگا کہ اس کی پیروی کی جائے۔

۳۔ یہ ان لوگوں کی مثال ہے جو سمجھ بوجھ اور ہدایت و رہنمائی دونوں سے بالکلیہ خالی ہوتے ہیں۔ گراوٹ و پستی کی ایک حالت یہ بھی ہے جس میں حق بات سننے، سمجھنے اور قبول کرنے کی ساری صلاحیتیں بیکار ہوتی ہیں۔ پھر بھی شیطان ایسے لوگوں کی پیروی کی طرف بلاتا ہے اور ان کے کام اور بات کو سند کا

درجہ دیتا ہے۔ اس مثال سے جس طرح گراوٹ و پستی کی انتہا ظاہر ہوتی ہے اسی طرح گمراہ کرنے میں شیطان کی انتہائی ذلت و کمینگی ظاہر ہوتی ہے۔

(۱۰) اہلِ ایمان کو خاص طور سے حکم

وہی بات جو اوپر تمام انسانوں سے کہی گئی تھی کہ حرام و گندی غذا سے پرہیز کریں، اب خاص طور سے اہلِ ایمان سے کہی جا رہی ہے۔ اس وجہ سے کہ اہل ایمان اس نقصان میں تو تمام انسانوں کے ساتھ برابر کے شریک ہیں جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے لیکن ان کے لیے ایک اور نقصان بھی ہے اور وہ یہ کہ حرام و گندی غذا سے وہ رشتہ اپنا اثر کھو دیتا ہے جو ایمان کے ذریعہ اللہ اور بندہ کے درمیان قائم ہوتا ہے۔ جیسا کہ ان دو روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ سے تعلق جوڑنے اور اس کو برقرار رکھنے میں حلال و پاکیزہ غذا کو کس قدر اہمیت حاصل ہے!

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص نہایت دور دراز کے سفر پر ہے، پریشان حال اور غبار آلود ہے (جس کی حالت سے انتہائی بے کسی و بے بسی ظاہر ہوتی ہے)۔ ایسی حالت میں وہ دعا کرتا ہے لیکن اس کا کھانا پینا اور لباس سب حرام کا ہے تو اس کی دعا کیسے قبول ہوگی؟

(۲) سعدؓ ابن ابی وقاص نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ آپ اللہ سے دعا فرما دیں کہ میری دعا قبول ہونے لگے۔ جواب میں آپ نے فرمایا کہ حلال و پاکیزہ غذا کی پابندی کرو، خود بخود دعا قبول ہونے لگے گی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ۝ (البقرة: ۱۷۲)

اے ایمان والو۔ جو ہم نے تمھیں پاکیزہ چیزیں عطا کی ہیں ان میں سے کھاؤ اور تم اللہ ہی کا شکر کرو اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو[1]

[1] اہل ایمان کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ جب ان کے ایمان میں مضبوطی نہیں رہتی تو عبادت تو اللہ کی کرتے ہیں لیکن جو پاکیزہ چیزیں اللہ نے عطا کی ہیں انکے لیے ولیوں اور بزرگوں یا دوسرے بروں کے ایسے شکر گزار

بنتے ہیں جیسے یہ چیزیں انہوں ہی نے دی ہوں۔ آیت میں اسی کمزوری کی اصلاح ہے کہ عبادت کے لائق وہی ہوتا ہے جو سب کچھ دیتا ہے۔ عبادت کسی کی اور شکرگزاری کسی اور کی، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ایمان دل میں مضبوط نہیں ہے، جس کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱۱) حرام کے بارے میں گمراہ قوموں کا دردناک رویّہ اور ان کا انجام

جو قومیں گمراہ ہوتی ہیں یا ذلیل و پست ہو جاتی ہیں حرام چیزوں کے بارے میں انکا رویہ نہایت دردناک ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جن چیزوں کے حرام ہونے میں اللہ کی شریعت اور کتاب نے کبھی اختلاف نہیں کیا ان تک کی حرمت کو چھپا لیتی ہیں اور اپنی خواہش و مرضی کے مطابق حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا لیتی ہیں۔

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۙ أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ۝ (البقرة : ۱۷۳ - ۱۷۶)

اللہ نے تو صرف یہ چیزیں تمہارے اوپر حرام کی ہیں۔ مردار، خون اور سور کا گوشت[۱]۔ اور وہ چیزیں بھی حرام کی ہیں جو اللہ کے سوا کسی اور کے لیے نامزد کی گئی ہوں[۲]۔ البتہ جو شخص لاچار ہو جائے تو اس کو ان حرام چیزوں کے کھانے میں کوئی گناہ نہیں ہے، اللہ معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ سرکشی کرنے والا اور حد سے بڑھنے والا نہ ہو[۳]۔ بیشک جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب میں سے چھپا

لیتے ہیں اور اس کے بدلے تھوڑی قیمت لیتے ہیں یہ لوگ اپنے پیٹوں میں صرف آگ بھر رہے ہیں اور اللہ قیامت کے دن ان سے نہ بات کرے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی اختیار کی اور بخشش کے بدلے عذاب خریدا یہ لوگ دوزخ کی آگ پر کس قدر زیادہ صبر کرنے والے ہیں؟ یہ اس وجہ سے کہ اللہ نے سچائی کے ساتھ کتاب اتاری اور بیشک جنہوں نے کتاب میں اختلاف کیا تو وہ ضد میں بہت دور جا پڑے[۴]

---

[۱] یہاں نہ حرام چیزوں کو گنانا مقصود ہے اور نہ انکی تفصیل بیان کرنا مقصود ہے چند حرام چیزیں بنا کر یہ دکھانا ہے کہ گمراہ اور پست قومیں کھانے پینے کی چیزوں میں بھی یہاں تک آزاد ہو جاتی ہیں کہ جن چیزوں کے حرام ہونے میں کسی شریعت اور کتاب نے اختلاف نہیں کیا ان کے حرام ہونے کو بھی ان کے علماء و پیشوا چھپا لیتے ہیں اور ان کو بھی حلال بنا لیتے ہیں اس طرح کتاب و شریعت کہنے کو تو باقی رہتی ہے لیکن اس پر عمل درآمد سے بچنے کے لیے ہزار قسم کی تدبیریں نکال لی جاتی ہیں اور حیلے بہانے تلاش کر لیے جاتے ہیں۔

[۲] کسی بزرگ، پیغمبر، ولی یا بت کے نام پر کسی جانور کو ذبح کر دیا جائے یعنی انکی نزدیکی حاصل کرنے اور انکو راضی و خوش کرنے کے لیے جانور کو یا کسی اور چیز کو انکی نذر کر دیا جائے وہ بھی شریعت میں حرام ہے اگرچہ جانور کو اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے اس سے اس کے حرام ہونے میں کوئی فرق نہ پڑے گا۔

[۳] لاچار و مجبور کو جان بچانے کے لیے حرام چیزوں کو کھانے کی اجازت ہے لیکن شرط یہ ہے کہ واقعی اس کی جان جا رہی ہو کسی قسم کی بناوٹ اور شرارت نہ ہو پھر اسی مقدار میں کھائے جس مقدار سے جان بچ جائے اس سے زیادہ نہ کھائے۔

[۴] دین بیچنے کے بدلہ میں جو دنیا آتی ہے وہ نقصان کے لحاظ سے گویا آگ ہے جو پیٹ میں جا رہی ہے اور سچائی کو قبول کرنے کی قوتوں اور صلاحیتوں کو جلا رہی ہے ایسا شخص اللہ کی تمام عنایتوں اور مہربانیوں سے محروم ہو جاتا ہے جو اللہ کے عام و خاص بندوں کے ساتھ ہوتی ہیں یہ سب کچھ اللہ کی سچی کتاب میں اختلاف کرنے اور اس پر عمل کرنے کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی وجہ سے ہے۔

عبدالرشید عراقی (۵)

محدثین کرام کی علمی خدمات

امام نسائی (م303ھ)

امام نسائی کا نام احمد بن شعیب اور کنیت ابو عبدالرحمان تھی۔ 215ھ میں خراسان کے شہر نساء میں پیدا ہوئے[1] اور 88 سال کی عمر میں 303ھ بمقام رملہ ان کا انتقال ہوا[2] آپ کے اساتذہ و شیوخ کی تعداد بہت زیادہ ہے ـــــ صحاح میں امام بخاری (م256ھ) اور امام ابو داؤد (م275ھ) آپ کے اساتذہ ہیں آپ کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ امام ابن السنی (م363ھ) اور امام محمد بن قاسم الاندلسی (م328ھ) جیسے کبار ائمہ حدیث آپ کے تلامذہ میں سے تھے[3]

امام نسائی نے تحصیل حدیث کے لئے مختلف شہروں کا سفر کیا اور ہر جگہ اساتذہ فن سے آپ نے استفادہ کیا[4] امام نسائی کے تبحر علمی، حفظ و ضبط، عدالت و ثقاہت اور فضل و کمال کا ارباب سیر اور علمائے فن نے اعتراف کیا ہے۔ علامہ ابن خلکان (م681ھ) لکھتے ہیں۔

کان امام عصرہ فی الحدیث[5]

وہ حدیث میں اپنے زمانے کے امام تھے

حافظ ابن حجر (م852ھ) امام دارقطنی (م385ھ) کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ

ابو عبدالرحمان احمد بن شعیب نسائی اپنے زمانہ کے تمام محدثین (امام بخاری و مسلم کے بعد) بلند اور اونچے تھے[6]

امام نسائی کے مسلک کے بارے میں اختلاف ہے۔ علامہ سبکی (م771ھ) نے ان کو شافعی المذہب لکھا ہے[7] حضرت شاہ عبدالعزیز (م1239ھ) نے بھی علامہ

سبکی کی تائید کی ہے[۸] محی السنۃ مولانا سید نواب صدیق حسن خاں (م 1307ھ) نے انہیں شافعی المذہب لکھا ہے[۹] علامہ سید انور شاہ کشمیری (م 1352ھ) نے لکھا ہے۔

امام ابو داؤد اور امام نسائی حنبلی المذہب تھے[۱۰]

مولانا ضیاء الدین اصلاحی مصنف تذکرۃ المحدثین و ایڈیٹر ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ لکھتے ہیں کہ

ہمارے خیال میں امام نسائی کسی خاص فقہی مسلک کے پابند نہ تھے بلکہ خود فقیہہ و مجتہد تھے[۱۱]

سنن نسائی۔ امام نسائی کی تالیفات میں سنن کے نام سے ان کی دو کتابیں ہیں۔ سنن کبریٰ اور سنن صغریٰ، صحاح ستہ میں سنن صغریٰ شامل ہے اور اس کا نام المجتبیٰ بھی ہے۔ امام نسائی امام محمد بن اسمٰعیل بخاری کے شاگرد تھے۔ اس لئے اس میں آپ نے شیخین کے طریقے کو اپنایا ہے اور علل حدیث کا اس پر اضافہ ہے۔ اس کے ساتھ حسن ترتیب اور جودت تالیف میں بھی ممتاز ہے۔ علامہ ابن رشد (م 731ھ) فرماتے ہیں۔

یہ کتاب علم سنن میں جتنی کتابیں تالیف ہوئی ہیں ان سب میں تصنیف کے لحاظ سے انوکھی اور ترتیب کے لحاظ سے بہترین ہے۔ اور بخاری و مسلم دونوں کے طریقہ کی جامع ہے۔ نیز علل حدیث کے ایک خاص حصہ کا بیان اس میں آ گیا ہے[۱۲]

حافظ سخاوی (م 902ھ) نے اپنی کتاب فتح المغیث میں محدث ابوالحسن معافری (م 403ھ) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ۔

جب تمام محدثین کی جمع کردہ حدیثوں پر نظر ڈالو گے تو جس حدیث کی امام نسائی نے تخریج کی ہوگی وہ دوسروں کی روایت کردہ حدیث کی بہ نسبت صحت کے زیادہ قریب ہوگی[۱۳]

سنن نسائی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ امام نسائی نے بعض ابواب کے عنوانات اس طرح قائم کئے ہیں جن سے ان کا تفقہ و استدلال ظاہر ہوتا ہے اور بعض عنوانات سے وہ اپنے مخالف مسلک کی تردید بھی کرتے ہیں۔ ان کے فقہ و اجتہاد کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ ایک ہی

حدیث کو متعدد ابواب میں نقل کر کے اس سے مختلف مسائل کا استنباط کرتے ہیں۔ ترتیب و تالیف کے لحاظ سے سنن نسائی کا پایہ بہت بلند ہے[14]

سنن نسائی صحاح ستہ کا رکن عظیم ہے۔ مگر افسوس کہ تعلیقات، حواشی اور شروح کی طرف کم توجہ کی گئی تاہم علامہ جلال الدین سیوطی (م 911ھ) نے زہر الربیٰ کے نام سے اس کی تعلیق لکھی۔ علامہ محمد بن عبدالہادی سندھی (م 1138ھ) اور علامہ شیخ حسین بن محسن انصاری الیمانی (م 327ھ) نے اس کے علمی حواشی لکھے۔ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی (م 1408ھ) اس کی شرح لکھی ہے جو التعلیقات السلفیہ کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ مولانا وحید الزمان حیدر آبادی (م 1238ھ) نے اس کا اردو میں ترجمہ اور شرح لکھی ہے جو مطبوع ہے۔

امام ابو یعلیٰ موصلی (م 307ھ)

امام ابو یعلیٰ موصلی کا نام احمد بن علی تھا۔ 207ھ میں موصل میں پیدا ہوئے[15] اور 307ھ میں سو سال کی عمر میں موصل ہی میں ان کی وفات ہوئی[16]

ان کے اساتذہ میں محدث کبیر امام یحییٰ بن معین (م 233ھ) کا نام آتا ہے۔ اور تلامذہ میں محدث ابن حبان (م 354ھ) اور امام ابو حاتم رازی (م 377ھ) کے نام ملتے ہیں۔ امام صاحب کے حفظ و ضبط، عدالت و ثقاہت اور تبحر علمی پر علمائے کرام نے اتفاق کیا ہے اور ان کو عادل و ثقہ اور حافظ و ضابط لکھا ہے[17]

مسند کبیر و مسند صغیر۔ امام ابو یعلیٰ موصلی نے دو مسندیں لکھیں ان کی مشہور مسند صغیر ہے۔ اس کو ترتیب کے لحاظ سے جامع بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م 1176ھ) نے مسند صغیر کو حدیث کے تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے[18]

مسند صغیر کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ حافظ ابن کثیر (م 774ھ) نے جامع المسانید و السنن اور علامہ محمد بن سلیمان (م 1094ھ) نے جمع الفوائد من جامع الاصول و جمع الزوائد میں اس کی حدیثیں درج کی ہیں[19]

امام ابن خزیمہ (م 311ھ)

امام ابن خزیمہ کا نام محمد بن اسحاق تھا۔ 223ھ میں نیشاپور میں پیدا ہوئے[۲۰] اور 88 سال کی عمر میں 311ھ میں وفات پائی[۲۱] امام صاحب کے اساتذہ کی فہرست طویل ہے۔ اوران کو امام اسحاق بن راہویہ (م 238ھ) سے ملاقات اور سماع کا شرف حاصل ہے[۲۲] تحصیل حدیث کے لئے آپ نے رے، بغداد، بصرہ، کوفہ، شام، حجاز، عراق، مصر اور واسط کا سفر کیا اور ہر جگہ اساطین سے اکتساب فیض کیا[۲۳]

امام ابن خزیمہ حفظ وضبط، عدالت وثقاہت، تبحر علمی اور فضل وکمال میں ممتاز تھے۔ اور ارباب سیر نے ان کے حفظ وضبط کا اعتراف کیا ہے۔ علامہ ابن کثیر (م 774ھ) نے محدث ابن حبان (م 354ھ) کا یہ بیان البدایہ والنہایہ میں نقل کیا ہے کہ۔

> حدیثوں کے اسناد و متون کا ابن خزیمہ سے بہتر کوئی حافظ میں نے نہیں دیکھا اور روئے زمین پر احادیث وسنن کے صحیح الفاظ اور زیادات کی یادداشت رکھنے والا ان کی مانند اور کوئی شخص نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سنن واحادیث کا تمام ذخیرہ ان کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے[۲۴]

حافظ ابن جوزی (م 597ھ) لکھتے ہیں کہ

> ابن خزیمہ حدیث میں بہت ممتاز اور نہایت فاضل تھے[۲۵]

فقہی مسلک میں وہ کسی خاص مذہب سے وابستہ نہ تھے بلکہ وہ مجتہد مطلق تھے[۲۶] حافظ ابن القیم (م 751ھ) نے لکھا ہے کہ ابن خزیمہ مقلد کی بجائے خود مستقل امام اور صاحب مذہب تھے[۲۷]

1۔ ابن حجر تہذیب التہذیب ج9ص26
2۔ احمد بن خلکان، وفیات الاعیان ج2ص59
3۔ ابن حجر عسقلانی، تہذیب التہذیب ج9ص79
4۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، بستان المحدثین ص123 16۔ احمد بن خلکان، وفیات الاعیان ج1ص65
5۔ ابن حجر تہذیب التہذیب ج9ص38

6 ۔ سبکی، طبقات الشافیہ ج2ص48
7 ۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، بستان المحدثین ص123
8 ۔ نواب صدیق حسن خاں، ابجد العلوم ص81
9 ۔ سید محمد انور شاہ، فیض الباری ج1ص58
10 ۔ ضیاء الدین اصلاحی، تذکرۃ المحدثین ج1ص59
11 ۔ سیوطی، مقدمہ زہر الربی ص3
12 ۔ سخاوی، فتح المغیث ص12
13 ۔ حاجی خلیفہ بن مصطفیٰ کشف الظنون ص26
14 ۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، بستان المحدثین ص35
15 ۔ ایضاً ص35
16 ۔ ابن کثیر البدایہ والنہایہ ج12ص130
17 ۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، حجتہ اللہ البالغہ ج1ص107
18 ۔ عبدالرحمان مبارک پوری مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص140 - 141
19 ۔ ابن جوزی، المنتظم ج6ص184
20 ۔ ابن کثیر البدایہ والنہایہ ج11ص149
21 ۔ ابن سبکی طبقات الشافعیہ ج2ص130
22 ۔ ایضاً ج2ص130
23 ۔ ابن کثیر البدایہ والنہایہ ج11ص149
24 ۔ ابن جوزی، المنتظم ج6ص184
25 ۔ ابن سبکی طبقات الشافعیہ ج2ص184
26 ۔ ابن القیم ۔ اعلام الموقعین ج2ص362

"جنّت کا شجر ممنوعہ"

شیخ محمد معین قریشی کے خطوط اور مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی کے مضمون کے جواب میں مدیر تکبیر، جناب محمد صلاح الدین کا موقف

آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں!

جنوبی ہند کی ایک نادر تفسیر (قسط ۲)

تفسیر فیض الکریم کا تعارف

—— از قلم: مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی ——

راقم السطور نے اس تفسیر کے مسودہ کا مدراس کے حالیہ سفر (مئی ۸۹ء) میں مطالعہ کیا۔ جو خاندان شرف الملک کے محفوظ کتب خانہ واقعہ مدرسہ محمدی مدراس میں بحفاظت موجود ہے۔ کتب خانہ کے نگراں جناب قاضی صلاح الدین صاحب ازہری نے بڑے اخلاق و کرم کے ساتھ اس تاریخی کتب خانہ کے مخطوطات و مسودات دکھائے۔

افسوس ہے کہ تفسیر کے پہلے حصّہ (تصنیف قاضی بدر الدولہ) میں سے جو چند پارے ۱۲۷۰ھ میں مطبع مظہر العجائب مدراس کے اندر چھپے تھے وہ بھی ختم ہو چکے ہیں اور باقی تفسیر مسودہ کی صورت میں محفوظ ہے —— جس کی طباعت کے ابھی تک آثار نظر نہیں آتے۔

پہلے حصّہ کا تعارف

اس حصّہ کی زبان مصنّف کے دور کی دکّنی اردو ہے، جس کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

"سو زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ کو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کاتب الوحی تھے، بلواتے اور ان سے جو عمر رضی اللہ عنہ سے کہے سو تقریر کہتے اور فرماتے:— تم جوان ہوشیار ہو، اعتمادی آدمی، تسپر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت وحی اتری تو صاحب ہی لکھا کرتے تھے۔ اب قرآن شریف جمع کرنے کے واسطے صاحب بھی ہمارے شریک ہوا چاہیے۔"

تفسیر کے مقدمہ میں قرآن کریم کے جمع و تدوین کی تاریخ بیان کی ہے اور مقدمہ سے پہلے تمہید میں ہندی (اردو) زبان میں قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کی طرف سے بے توجہی پر اظہار افسوس کیا ہے۔

تمہید کی عبارت دکنی اسلوب کے باوجود نہایت مقفیٰ اور مسجع ہے، جو درج ذیل ہے:-

"حمد و نعت کے بعد کہتا ہے۔ بندۂ ضعیف گنہ گار صبغۃ اللہ بن محمد غوث بن ناصر الدین محمد حشرہم اللہ فی زمرۃ الابرار، سبحان اللہ اس خالق کے سخن کی کیا شان ہے جس کے معانی اور الفاظ کے وصف میں دانا کی عقل حیران ہے۔ اس کا ہر ایک حرف اسرار و حقایق کے چمن کی بہار ہے اور ہر ایک نقطہ لطائف و دقائق کا گلزار ہے۔ وہی اللہ کی حبل متین ہے، جس نے اس کو استوار پکڑا کبھی اوسے خلل نہیں اور وہی فیصل کرنے والا ہے حق و باطل میں، ہرگز اوس میں ہزل نہیں۔ اس کے عجائب کو نہایت نہیں اس کو مکرر پڑھنے سے خاطر پہ ملالت نہیں۔ آگے کے عالموں کو اللہ تعالےٰ غریق رحمت کرے جنھوں نے قرآن شریف کو جاننے کے واسطے کئی کتابیں تفسیر کی تصنیف کیں اور اس کو حاصل کرنے کے واسطے بہت سے علوم استنباط کیے اور اسی زبان میں سب علوم کو لکھنے لگے۔ پس عربی زبان اس قدر رواج پاتی جو کوئی وہ نہ سیکھے اس کو عالم نہیں کہتے ہند کے اکثر سلاطین زبان فارسی بولتے تھے، اس لیے وہاں کے اکثر اہل اسلام کو فارسی تحصیل کا شوق ہوا۔ اور وے سب اپنے کاروبار اسی زبان میں لکھنے لگے اور اسی زبان میں بہت سی کتابیں اور تفسیر اور دوسرے علوم میں لکھیں بنابر اس کے ہندی زبان میں کوئی کتاب تصنیف کرنا سبک ٹھیرا۔ ہاں مگر قصیدے اور اشعار اور جھوٹے قصے کہانیاں اکثر لکھا کرتے ہیں۔ اس وقت کے لوگوں کو یہ توفیق کہاں جو عربی علوم کی تحصیل کی طرف متوجہ ہوں اور یہ بھی دشوار ہو گیا کہ فارسی میں اچھی لیاقت بہم پہنچا دیں کیونکہ روزی کے فکر میں پریشان و سرگردان ہیں

قطع نظر اس کے اگر حاصل بھی کریں تو زبان کی مہارت میں ایک عمر صرف ہو باوصف اس کے بھی اکثر لوگ درجۂ کمال کو نہیں پہنچتے اس لیے اکثر لوگ علم سے بے بہرہ اور دین کی باتوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ الحق اپنے ملک کی بھاکے[1] میں کسی فن کو لکھنا عوام کی معرفت کا سبب ہوتا ہے۔ علی الخصوص عورتیں کہ ان کو ہندی زبان کے سوائے دوسری زبانوں سے آشنائی نہیں۔ فضیلت دستگاہ مولوی محمد باقر آگاہ جعل الجنۃ مثواہ نے چند کتابیں دینی علوم کے ہندی زبان میں بنائے کہ جس سے ایک عالم کو فائدۂ عظیم ہوا۔ ان ایام میں حکام کی رغبت اردو زبان کی طرف دیکھ کے بہت سی کتابیں ہندی میں لوگ تصنیف کیے پھر یہ عاصی بھی ہندی زبان میں چند کتاب بنایا۔ مگر کوئی ایسی تفسیر کہ جس کے دیکھنے سے خاطر کو تشفی ہو سو نظر نہ آئی اس لیے یہ عاصی ایک تفسیر ہندی کہ جس میں شان نزول اور ضروری باتیں مذکور ہو لکھنا شروع کیا۔ جناب الٰہی میں التجا یہ ہے کہ اس کے اتمام کی توفیق دیوے اور اس کے دیکھنے والوں کو نیک راہ بتاوے۔"

اِس کے بعد ہر ہر سورت کی آیات پاک کی ایک ایک کر کے تشریح کی ہے۔ اس تفسیر کو پڑھنے سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی بدر الدولہ نے نہ صرف مشہور کتب تفاسیر ہی سے استفادہ کیا ہے بلکہ احادیث کی اکثر کتابوں اور نیز مشہور علمائے اسلام کی ہم تصنیفات سے بھی استشہاد کیا ہے۔ بنی اسرائیل کے قصوں کے بیان میں توریت زبور اور انجیل کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ فقہی اور کلامی مسائل میں کافی توضیح سے کام لیا ہے اس طرح کہ ان مسائل میں اس تفسیر کے پڑھنے والے کو دوسری کتابوں کے دیکھنے کی حاجت نہیں رہتی۔

تفسیر کا دوسرا حصہ

یہ حصہ مفتی محمد سعید خاں صاحب (ولادت $\frac{۱۲۴۷ھ}{۱۸۳۱ء}$ وفات $\frac{۱۳۱۲ھ}{۱۸۹۴ء}$) کا

---

[1] زبان

تصنیف کردہ ہے۔

مفتی صاحب مدراس کے بڑے علماء میں شمار کیے جاتے تھے، آپ سر سالار جنگ اوّل وزیر اعظم حیدرآباد کی خواہش پر مدراس سے حیدرآباد منتقل ہو گئے تھے، اور ریاست حیدرآباد میں نہایت اعلیٰ انتظامی اور علمی مناصب پر فائز رہے تھے۔

آپ نے ہر موضوع پر نہایت بلند پایہ تصنیفات چھوڑی ہیں۔

آپ کے حصّہ کی تفسیر علمی مباحث اور تفسیری مسائل میں اپنے والد کے جامع اسلوب کا نمونہ ہے اور اُردو زبان دکنی اسلوب سے مختلف فصیح و شستہ اُردو ہے۔

نمونہ حسب ذیل ہے؛

یہ سورۃ مکی ہے اسکی اٹھانوین آتین ہین اور سات سو کلمی اور تین ہزار سات سو حروف

ہین بسم اللہ الرحمن الرحیم کہیعص ابن عباس رضی اللہ عنہما

نے کہا یہ اللہ تعالی کے نامون مین سے ایک نام ہے اور بعضی کہتے ہین یہ قرآن کا

نام ہے اور بعضی کہتے ہین یہ قسم ہے جسکے ساتھ اللہ تعالے نے قسم کھائی ہے

اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت یہ ہے کہ کھیعص مین کاف کریم و کبیر کا

اور ھا ہادی کی اور یا رحیم کی اور عین علیم کا اور صاد صادق کا ہے اور بعضے

کہتے ہین اسمین اشارہ ہے کہ وہ کافی ہے مخلوق کو ہادی بندون کا

عالم بریہ ہے صادق ہے اپنی وعدہ مین سدی کا قول ہے کہ یہ اللہ

کا اسم اعظم ہے بعضی کہتے ہین سورۃ کا نام ہے علی اور یحیی نے کھیعص کو

کسر ھا و یا سے پڑھا ہے اور نافع نی درمیان کسرہ اور فتح کے پڑھا ہے اور قرب

تفسیر کا تیسرا حصہ

یہ حصہ تیسرے مصنف مفتی محمود صاحب کا تصنیف کردہ ہے، اس کی زبان اور بیان کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

مقت کے معنے سخت بغض کے ہیں یعنی کافرون کا کفر انکے رب کے پاس بغض وغضب ہی زیادہ کریگا اور کفار بسبب کفر کے مورد غضب الہی کے ہونگے وَلَا یَزِیدُ الْکٰفِرِیْنَ کُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا اور نہ زیادہ کریگا کافرون کو انکا کفر مگر نقصان - یعنی کافرون کو کفر کے سبب سے آخرت مین بڑی خسارت ہوگی۔ آیت مین ولا یزید الکافرین کفرہم کا جملہ مکرر ذکر کیا تاکہ دلالت کرے کہ غضب الہی اور خسارت اخروی سے ہرایک کے لئے مستقل طور پر کفر سبب ہے جو کفر کی برائی اور اس سے پرہیز کرنے کو لازم ہے انہیے قُلْ اَرَاَیْتُمْ شُرَکَآءَکُمُ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْکٌ فِی السَّمٰوٰتِ (ای بی) کہدو بھلا دیکہا ہے تم نے اپنے ان شرکون کو جنھین پوجتے ہو خدا کے سوا سے مجھے دکہلاؤ کہ انہون نے کیا پیدا کیا ہے زمین سے یا انکے لیے شرکت ہے آسمانون مین -

تفسیر کا چوتھا حصہ

یہ حصہ مصنف اوّل کے فاضل پوتے مولانا ناصرالدین ابن قاضی عبیداللہ کا تصنیف کردہ ہے۔ مولانا ناصرالدین اپنے عہد کے بڑے علماء میں سے تھے، اپنے خاندانی مدرسہ مدرسہ محمدی کے فارغ التحصیل تھے، آپ نے اپنی عمر کا بڑا حصہ حیدرآباد کی ملازمت میں گزارا اور اس کے ساتھ علمی کاموں میں بھی مشغول رہے۔ تفسیر فیض الکریم کی تکمیل انہی کا عظیم کارنامہ ہے۔ آپ نے اپنے پیش رو اکابر کے فاضلانہ انداز کو بڑی خوبی سے

نبھایا۔ اور تفسیر کی تکمیل کے علاوہ ایک کتاب فتح العظیم فی تخریج احادیث فیض الکریم بھی تصنیف فرمائی۔ یہ کتاب ایک نامکمل مخطوطہ کی شکل میں کتب خانہ شرف الملک کے ذخیرہ میں موجود ہے۔ افسوس ہے کہ مولانا مرحوم کی تحقیقی کاوشیں مسودات سے آگے نہ بڑھ سکیں۔

تفسیر کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"حُورٌ مَّقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ (ان کے لیے) حورین ہیں روکے ہوئے (پردہ نشین) ہیں خیموں میں۔ اور یہ بدل پڑا ہے خیراتٌ حسانٌ کا۔ اور وہ حورین پردہ میں ڈھانپے ہوئے ہوں گے کہ ہرگز باہر نہ آویں گے بوجہ کرامت و بزرگی اپنے اور بعض کہتے ہیں امرأة قصيرة وقصورة ومقصورة اى مخدرة یعنے پردہ نشین اور گوشہ نشین یا متصورات ہیں یعنے صرف اپنے شوہروں پر اپنی نگاہ کو متصور رکھتے ہیں اور ان سے تجاوز نہیں کرتے۔ اور حور جمع حوراء کی ہے۔ وہ حورین خوبصورتی کے ساتھ سپید اور سیاہ آنکھیں والی۔ اور خیام جمع خیمہ کی ہے۔ اور بعض کہتے ہیں جمع خیم کی ہے اور خیم جمع خیمہ کی ہے اور خیام یعنے اُن کے سکونت کے لیے حجلے بنے ہیں اور وہ موتی کے قبتہیں۔ الحاصل باوجود کھانے پینے اور باغ و محل کی نعمتوں کے، علاوہ ان کی رفاقت اور اُن کے لیے بہتر یا کدامن و خوبصورت زوجات بھی موجود ہونگے۔ روایت کیا ہے ابن ابی حاتم نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہ انہوں نے فرمایا ہر مسلمان کے لیے خیمہ یعنی حسین اور نیک صفات کی عورت ہوگی اور ہر ایک خیرہ کے لیے ایک خیمہ ہوگا اور ہر ایک خیمہ کے لیے چار دروازہ ہونگے اور ہر دروازہ سے فرشتے ہر روز تحفہ و کرامت و ہدیہ لاویں گے۔"

"فیض الکریم" ولی اللّٰہی خدمات کے تذکرہ سے خالی کیوں؟

یہ بات تاریخ کے ایک طالب علم کے لیے ضرور باعث اضطراب ہے کہ قاضی بدرالدولہ نے اپنی تفسیر کے دیباچہ میں دینی اور قرآنی علوم کے ہندی (اُردو) زبان میں منتقل ہونے کی ضرورت کا اظہار کیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں مدراسی عالم مولانا باقر آگاہ کی خدمات کا تذکرہ کیا ہے لیکن قاضی صاحب جس وقت اردو میں تفسیر قرآن کا کام کرنے بیٹھے اس سے پچاس برس پہلے ولی اللّٰہی خاندان کے دو بزرگوں (شاہ عبدالقادر صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب) کے اُردو ترجمے وجود میں آچکے تھے، ان کا کوئی ذکر خیر نہیں کیا۔ شاہ عبدالقادر صاحب کے اردو ترجمہ موضح القرآن کا سنِ تالیف ۱۲۰۵ھ ہے اور قاضی صاحب کی وفات ۱۲۸۰ھ

میں ہوئی ہے قاضی صاحب نے اردو میں اسلامی تعلیمات کی اشاعت کے سلسلہ میں مولانا باقر آگاہ کا تذکرہ کیا ہے اور مولانا باقر کی وفات ۱۲۲۰ھ میں ہوئی اس کا مطلب یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب کے اردو تراجم کا دور بھی ان سے مقدم ہے۔ مولانا باقر نے اردو مثنوی میں قرآن کریم کے فضائل اور آداب تلاوت پر نہایت تفصیل سے کلام کیا ہے اور اردو میں اس مثنوی کو اپنی نوعیت کی پہلی مثنوی قرار دیا گیا ہے ـــــ یہ مثنوی بھی ۱۲۱۹ھ میں لکھی گئی یعنی موضح القرآن کے پانچ سال بعد۔

یہ بات نہیں ہے کہ جنوبی ہند کا یہ خاندان شمالی ہند کے علمی اور روحانی بزرگوں سے بالکل بے تعلق رہا، کیونکہ قاضی بدرالدولہ کے صاحبزادے مفتی محمود صاحب نے اپنی تفسیر کے حصہ میں مولانا شاہ مظہر صاحب مجددی کا تذکرہ کیا ہے، جن سے وہ بیعت تھے بلکہ مولانا شاہ ابوالحسن صاحب زید دھلوی کی تحقیق کے مطابق مفتی صاحب شاہ مظہر صاحب کے خلفاء میں شامل تھے۔

شاہ محمد مظہر صاحب مولانا شاہ احمد سعید صاحب کے صاحبزادے ہیں جو مشہور مجددی بزرگ حضرت مرزا جانِ جاناںؒ کے سلسلہ کی اہم کڑی تھے۔ شاہ مظہر صاحب ۱۳۰۱ھ میں مدینہ منورہ کے اندر فوت ہوئے اور جنت البقیع میں حضرت عثمان غنیؓ کے قریب دفن کئے گئے۔ مفتی محمود صاحب زید میاں صاحبؒ کے والد مولانا شاہ ابوالخیر صاحبؒ سے ملاقات کرنے دہلی بھی آئے تھے۔

دہلی کے اس مجددی خاندان نے تحریک جہاد (مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ) کے ساتھ مخالفانہ طرز عمل اختیار نہیں کیا۔ تاریخ میں اس کی کوئی شہادت موجود نہیں البتہ اہل تصوف ہونے کی وجہ سے یہ خاندان ولی اللّٰہی تحریک اصلاح سے بالکل الگ تھلگ رہا۔ اس خاندان کے موجودہ بزرگ (مولانا زید صاحب قبلہ) نے اپنی خاندانی روایات کے خلاف مولانا شہید کی تقویت الایمان کے بارے میں ایک تنقیدی کتاب تحریر کی اور امام ابن تیمیہ پر ایک تردیدی کتابچہ شائع کیا۔ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی القول الجلی کے اردو ترجمہ پر ایک مقدمہ تحریر فرمایا جس میں زید صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاہ ولی اللہ کی کتابوں میں جو اصلاحی باتیں (ردِ بدعات سے متعلق) نظر آتی ہیں وہ سب الحاقی ہیں۔ زید میاں صاحب نے یہ محاذ قائم کر لیا ہے جو ان کے بزرگوں کی روایات سے میل نہیں کھاتا۔

بہرحال یہ ایک ضمنی بحث تھی ـــــ سوال یہ ہے کہ جنوبی ہند کا یہ خاندان ولی اللّٰہی خاندان کی خدمات سے بے تعلق اتفاقیہ طور پر نہیں رہا ـــــ بلکہ اس کا ایک خاص سبب معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کا

یہ خاندان انگریزی حکومت کے اس پروپیگنڈہ سے متاثر تھا جو وہابی تحریک کے نام سے حکومت کی طرف سے کیا جارہا تھا اور جس کا مقصد بالاکوٹ کی تحریک جہاد کے اثرات کو مسلمانوں میں کم کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ شرف الملک مرحوم کا خاندان جنوب کی ریاستی حکومتوں کے عہدوں سے وابستہ رہا اور جب جنوبی ہند کی مسلم ریاستیں ختم ہوگئیں تو حکومت انگلشیہ نے اس خاندان کے علماء کی سرپرستی کی، جیسا کہ مصنف "فقہاء ہند" نے "نزھۃ الخواطر" کے حوالہ سے لکھا ہے۔

خاندان ولی اللہؒ اپنی اصلاحی اور انقلابی جدوجہد کی وجہ سے مغل حکمرانوں اور سرکار انگلشیہ دونوں کی نظروں میں معتوب اور مغضوب رہا۔ انگریز حکومت نے اس خاندان کی تحریک جہاد کو بدنام کرنے کے لیے اُسے تحریک وہابیت کا نام دیا اور سرزمین حجاز کی نجدی تحریک اصلاح سے اسے جوڑنے کی زبردست سازش کی اور ہندوستانی علماء کے ایک طبقہ کو حُبِّ رسول اور حُبِّ اولیاء اللہ کے نعرہ پر ان کے مقابلہ میں کھڑا کر دیا۔

وہابیت سے نفرت کی انگریزی لہر جنوبی ہند کی طرف بھی گئی اور نواب ارکاٹ محمد غوث خاں اعظم کے میر منشی سید محمد اسحاق (خطاب یافتہ طرازش خاں بہادر) نے ردِّ وہابیہ کے نام سے ایک رسالہ تصنیف کیا۔ طرازش خان صاحب علم تھے اور انہوں نے قاضی صبغۃ اللہ (بدر الدولہ) سے بھی علم حاصل کیا تھا۔ ان کے رسالہ کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر محمد غوث صاحب (عثمانیہ یونیورسٹی) نے جو الفاظ تحریر کئے ہیں وہ قابل غور ہیں:-

"رسالہ ردّ وہابیہ کو انہوں نے ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء میں تصنیف کیا تھا۔ اس زمانہ میں کلکتہ، بنگال، حیدرآباد، مدراس، اور کشمیر میں وہابی تحریک بہت زور پکڑ رہی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اس تحریک کے خلاف تھی۔ کمپنی نے اس تحریک کو کچلنے کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

۱۸۴۱ء سے ۱۸۷۱ء تک گرفتاریوں کا سلسلہ جاری تھا، سینکڑوں بے گناہوں کو خلافِ قانون جیلوں میں ڈال دیا گیا تھا اور ان پر بے پناہ مظالم کئے جارہے تھے"۔

(تعارف اردو مخطوطات صفحہ ۲۲)

تبصرہ نگار خاندان شرف الملک کے ایک فاضل رکن ہیں۔ موصوف نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ظلم وستم کی طرف واضح اشارات کئے ہیں۔ اس ماحول کو سامنے رکھ کر یہ بات بآسانی سمجھ میں

آجاتی ہے کہ سرکار انگلشیہ سے تعلق رکھنے والے اہل قلم نے وہابی تحریک کے خلاف جو قلم اٹھایا دراصل اس کا مقصد انگریزوں کے ظلم وستم پر پردہ ڈالنا تھا اور مسلم عوام میں اس ظلم وستم کے خلاف غم وغصہ نہ پھیلے، اس کی کوشش کرنی تھی۔ علماء کے ایک طبقہ نے دانستہ طور پر انگریزی پروپیگنڈہ میں حصہ لیا اور کچھ حضرات ایسے بھی تھے جو نادانستہ طور پر شریک ہو گئے یا کم از کم اس گروہ سے بے تعلق رہے۔

خاندان شرف الملک کے محفوظ قلمی ذخیرہ کی فہرستوں پر نظر ڈالنے سے اس ذخیرہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور ان بیش قیمت علمی اور تاریخی نوادرات کی جس طرح یہ خاندان حفاظت کر رہا ہے اس سے اس خاندان کی اخلاقی عظمت ظاہر ہوتی ہے اور معاشی خودداری بھی۔ جہاں تک مذکورہ بالا تفسیری ذخیرہ کا تعلق ہے اردو زبان میں اتنا عظیم ذخیرہ کسی دوسری تفسیر کی صورت میں موجود نہیں ہے۔ پھر آخری مصنف نے اس تفسیر کی احادیث کی تخریج کے لیے جو محنت کی ہے اس نے اس تفسیر کی اہمیت کو مزید بڑھا دیا ہے ـــــ لیکن سوال تو اس مسودہ کی اشاعت کا ہے۔ جنوبی ہند مدراس اور حیدرآباد میں اس خاندان سے متعلق بڑے بڑے اہل علم موجود ہیں جو اس مسودہ کو صاف کر کے طباعت کے قابل بنا سکتے ہیں۔

اس علاقہ میں ایسے اہل ثروت مسلمانوں کی بھی کمی نہیں جو اس کی طباعت کا بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ عصر جدید کی موجودہ کامیاب تفسیروں (ترجمان القرآن، تفہیم القرآن، معارف القرآن) کے ہوتے ہوئے اس قدیم تفسیر کی اہمیت کم ہو جاتی ہے ـــــ لیکن تفسیر کے قدیم مباحث ومسائل کا اتنا بڑا ذخیرہ اردو زبان میں کسی ایک جگہ مل جائے، یہ ضرورت اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے۔

بقیہ: صدق اللہ العظیم

کا خیال تب نہیں آتا۔ آئے بھی کیسے؟ چھوڑنے کا خیال تو اُس عمل کے متعلق آسکتا ہے جس کو انسان بُرا یا گناہ سمجھتا ہو۔ مگر جس عمل کو وہ بُرا یا گناہ ہی نہ سمجھتا ہو اُس کے چھوڑنے کا خیال ہی کیسے آسکتا ہے اور غالباً اسی وجہ سے ایک حدیث میں آتا ہے کہ بدعتی کو توبہ نصیب نہیں ہوتی۔

شیطان نے جب دیکھا کہ چور، زانی، شرابی، وغیرہ لوگ تو کبھی اپنے گناہوں سے توبہ کر بھی لیتے ہیں کیونکہ ان اعمال کو وہ بُرا جانتے ہوئے کرتے ہیں۔ اور اس طرح انسانوں کو گمراہ کرنے کی اس کی تمام تر محنت اور کوشش ضائع ہو جاتی ہے تو اُس نے اُن کو بدعت کے جال میں پھنسانا شروع کر دیا تاکہ وہ اس سے کبھی نکل ہی نہ سکیں۔ (جاری ہے)

نقطۂ نظر

سید عبدالرؤف

"صدق اللہ العظیم"

علماء اور قرّاء کے لیے لمحۂ فکریہ

محمدی مسجد چاندنی چوک ناظم آباد کے خطیب سید عبدالرؤف صاحب قدیم اور جدید دونوں علوم پر یکساں دسترس رکھتے ہیں۔ موصوف کراچی کی مختلف مساجد میں خطابت کے ساتھ ساتھ جامعہ کراچی میں لیکچرار کے طور پر اپنی ذمہ داریاں بھی نبھاتے رہے ہیں زیر نظر مضمون میں انہوں نے تلاوتِ قرآن کے اختتام پر پڑھے جانے والے الفاظ "صدق اللہ العظیم" کی شرعی حیثیت کے بارے میں کلام فرمایا ہے کہ تلاوتِ قرآن سے متصل ان الفاظ کا مستقلاً ادا کرنا دینی نقطہ نگاہ سے کیا مقام رکھتا ہے۔ سید صاحب نے تمہیداً ایک اور اہم موضوع یعنی بدعت کی حقیقت اور اس کی شناعت پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ جو خود اپنی جگہ مکمل مضمون کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ ذیل میں مضمون کا پہلا حصہ پیش خدمت ہے۔ (ادارہ)

قرآن مجید کی تصریحات کے مطابق، شیطان، انسان کا ازلی اور کھلا دشمن ہے، جب وہ راندۂ درگاہ ہوا تو اُس نے اللہ تعالیٰ کو کھلا چیلنج کرتے ہوئے کہا کہ:

بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ (الحجر-۳۹)

"تو نے مجھے آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے راندۂ درگاہ تو کیا ہے میں بھی انتقاماً آدم علیہ السلام کی اولاد کو زمین میں سبز باغ دکھا کر ہر ممکن طریقہ سے گمراہ کر کے رہوں گا۔"

چنانچہ وہ انسان کو گمراہ کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتا اور اپنے اس مشن میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہو رہا ہے، چنانچہ خود اللہ جلّ مجدہٗ کا ارشاد ہے، وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ (سبا - ۲۰) یعنی انسان کو گمراہ کرنے کے متعلق شیطان کا خیال ٹھیک نکلا اور وہ اس کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ انسان کو گمراہ کرنے اور اس کو غضبِ الٰہی کا

مورد بنانے کا سب سے بڑا اور کارگر ہتھیار شیطان کے ہاتھ میں اس کو شرک میں مبتلا کرنا ہے۔

شرک ایسا گناہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ چنانچہ فرمانِ الٰہی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النساء - ۱۱۶)

"اللہ تعالیٰ شرک کو کبھی معاف نہیں کرتا اس کے علاوہ دیگر گناہوں کو جس کے لئے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔"

شیطان، انسان کو گمراہ کرنے اور اس کو عذابِ الٰہی میں مبتلا کرنے کے اس حربہ میں بڑی حد تک کامیاب ہو گیا ہے کہ ایمان و اسلام کے مدعی شرک کی لعنت میں کسی نہ کسی طرح پھنس جاتے ہیں۔ شرکِ خفی (چھپا ہوا) ہی نہیں بلکہ اب تو اکثر کلمہ گو شرک جلی (کھلم کھلا شرک) کا ارتکاب کرتے نظر آتے ہیں، مثلاً غیر اللہ کو مدد کے لئے پکارنا، غیر اللہ کی نذر و نیاز کرنا، قبروں کا طواف کرنا بلکہ ان کو سجدہ کرنا وغیرہ، اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ، خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (یوسف - ۱۰۶)

"اکثر لوگ ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود مشرک ہوتے ہیں۔"

شرک کے علاوہ حضرتِ انسان کو عذابِ الٰہی میں مبتلا کرنے اور اس کو اللہ کی رحمت سے محروم کرنے کے لئے شیطان کے پاس ایک اور حربہ ہے اور وہ ایسا جال ہے کہ انسان اس میں آسانی سے پھنس جاتا ہے کہ اس کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ وہ ایک خطرناک جال میں پھنس گیا ہے اس لئے اس سے نکلنے کا اس کو خیال تک نہیں آتا وہ جال ہے "بدعت" کا۔ بدعت کیا ہے؟ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف احادیث میں بڑی وضاحت سے بیان کر دیا ہے مثلاً ایک حدیث میں آپ کا فرمان ہے:

۱۔ مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ (بخاری و مسلم)

ترجمہ "جس نے ہمارے اس کام یعنی دین میں کوئی ایسی بات نکالی جو اس میں سے نہیں ہے (یعنی اس کا ثبوت قرآن و حدیث میں نہیں ہے) تو وہ عمل بھی

عنداللہ مقبول نہیں ہے اور اُس کا کرنے والا بھی اللہ کی رحمت سے دور ہے۔"

اسی حدیث کی ایک اور روایت کے الفاظ ہیں کہ :

۲۔ مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ اَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ (مسلم) یعنی جس نے کوئی ایسا کام کیا جو ہمارے (یعنی میرے اور میرے صحابہ) کے طریقہ کے مطابق نہیں ہے تو وہ عمل بھی مقبول نہیں اور اس کا کرنے والا بھی راندۂ درگاہِ باری تعالیٰ ہے۔

۳۔ ایک اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں :

اِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ وَّشَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ (مسلم) یعنی بہترین بات اللہ کی بات ہے اور بہترین طریقہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا طریقہ ہے اور بدترین کام نئے کام ہیں اور (دین میں) ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے ـــــ اور اسی حدیث کی ایک روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں : وَكُلَّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ (نسائی) یعنی ہر گمراہی دوزخ میں لے جانے والی ہے

۴۔ اس سلسلہ کی ایک اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں :

مَا مِنْ نَّبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِيْ اُمَّتِهٖ قَبْلِيْ اِلَّا كَانَ لَهٗ فِيْ اُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ وَاَصْحَابٌ يَّاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَيَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ يَّقُوْلُوْنَ مَالَا يَفْعَلُوْنَ وَيَفْعَلُوْنَ مَالَا يُؤْمَرُوْنَ فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَيْسَ وَرَآءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ (مسلم) یعنی مجھ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جس نبی کو بھی کسی امت میں بھیجا تو اُس کی امت میں سے اُس کے حواری اور ساتھی ہوتے تھے جو کہ اُس کی سنت پر عمل کرتے تھے

اور اُس کے احکام پر عمل کرتے تھے لیکن اُن کے بعد کچھ نالائق لوگ آتے تھے کہ جو وہ کہتے تھے اس پر عمل نہیں کرتے تھے، اور وہ کام کرتے تھے جن کے کرنے کا اُن کو حکم نہیں دیا جاتا تھا، پس ایسے لوگوں سے جو شخص ہاتھ سے جہاد کرے گا وہ مومن ہوگا اور جو اُن سے زبان سے جہاد کرے گا وہ بھی مومن ہوگا اور جو اُن سے دل سے جہاد کرے گا (یعنی اُن کو دل میں بُرا جانے گا) وہ بھی مومن ہوگا، مگر اس کے بعد تو رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان نہیں رہے گا۔"

مذکورہ بالا اور اِن جیسی دیگر احادیث سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوئیں:۔

۱ دین میں ہر وہ نئی بات جس کا ثبوت کتاب وسنّت یا صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے عمل سے نہ ہو، بدعت ہے، خواہ وہ عمل بظاہر کتنا ہی اچھا معلوم ہوتا ہو۔

۲ ہر وہ عمل جو بدعت پر مبنی ہو وہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں قبولیت حاصل نہیں کر سکتا۔

۳ بدعتی شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہوتا ہے۔

۴ جس عمل کو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم یا صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے نہیں کیا اس کا کرنا گمراہی ہے اور جس عمل کو کیا ہو اُس کا نہ کرنا بھی گمراہی ہے، مثلاً نماز میں کوئی فعل یا حرکت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم یا صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے کی ہو اُسے ہم نہ کریں یا جو نہیں کی اُسے ہم کریں تو ایسی نماز ہرگز عند اللہ مقبول نہیں ہوگی۔

۵ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنّم میں لے جانیوالی ہے۔

۶ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سُنّت کی سختی سے پیروی کرنا اور اُس کے احکام کی بجاآوری ایمان کے لئے ضروری ہے۔

۷ ایسی بات کہنا یا ایسا عمل کرنا جس کا شارع نے حکم نہ دیا ہو ناجائز ہے۔

۸ جو لوگ ایسی بات کہتے ہوں جس پر وہ خود عمل نہ کرتے ہوں یا دینی امور میں ایسی بات کرتے ہوں جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے یا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے نہ دیا ہو، اُن سے ہاتھ، زبان یا کم از کم دل سے جہاد کرنا یعنی اُن کو دل میں بُرا جاننا ضروری ہے۔

۹ اگر ایسے اہلِ بدعت اور گمراہ لوگوں سے نفرت نہ کی جائے اور اُن کو دل سے بھی بُرا نہ

جانا جائے تو ایمان بالکل ختم ہو جاتا ہے (بالفاظ دیگر ایسے لوگ بے ایمان ہوتے ہیں، اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْہُ)

جب ایسے ناخلف اور بُرے لوگوں سے دل سے بھی جہاد نہ کرنے والا ایمان سے کورا ہو جاتا ہے تو پھر جو لوگ خود ان باتوں کے مرتکب ہوں (یعنی جو وہ کہتے ہوں اس پر عمل نہ کرتے ہوں اور دینی امور میں وہ باتیں کرتے ہوں جن کا حکم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم نے نہ دیا ہو) اُن کا ایمان کہاں باقی رہ سکتا ہے اور وہ ایماندار کیسے رہ سکتے ہیں۔

الغرض بدعت، دین کے لئے نہایت تباہ کن چیز ہے جس کا انسان کو احساس تک نہیں ہوتا۔ بعض روایات کے مطابق بدعت کی ایک خرابی یہ بھی ہے کہ بدعتی شخص کے دیگر نیک اعمال مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ بھی اُس وقت تک قبول نہیں ہوتے جب تک وہ بدعت کو چھوڑ نہ دے۔ دیکھا جائے تو بدعت کا مرتکب گویا شارع یعنی اللہ تعالیٰ یا رسول ہونے کا عملاً دعویٰ کرتا ہے، جس سے بڑھ کر اور کیا کفر ہوگا۔ کیونکہ کسی عمل کو دین کا حصّہ بنانا یا اس کو خوشنودیٔ باری تعالیٰ کا موجب تصوّر کرانا صرف اللہ تعالیٰ یا اُس کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ہی کام ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

اَمْ لَھُمْ شُرَکٰٓؤُا شَرَعُوْا لَھُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا لَمْ یَاْذَنْ بِہِ اللّٰہُ (الشوریٰ-۲۱)

یعنی کیا ان لوگوں نے اللہ کے علاوہ اوروں کو اللہ کا شریک بنا رکھا ہے جو اِن کے لئے دین میں ایسی باتیں ایجاد کرتے ہیں جس کو اللہ نے دین میں داخل نہیں کیا۔

دیکھا جائے تو بدعت ایجاد کرنا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی شان میں ایک بڑی گستاخی ہے، بدعت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے بڑھ کر ہم اللہ کی خوشنودی کی باتوں کو جانتے ہیں۔ آپ نے تو کسی کام کو اللہ کی خوشنودی کا سبب ہونا بتایا نہیں، مگر ہم اس راز کو پا گئے کہ اِس بدعتی عمل میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی مضمر ہے۔ بدعت میں ایک پہلو نعوذ باللہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر خیانت اور کتمانِ حق کے الزام کا بھی نکلتا ہے۔ بایں طور پر کہ بدعت ایجاد کرنے والا اور اس پر عمل کرنے والا عملاً یہ بتا رہا ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے خوشنودیٔ

باری تعالیٰ کے بعض اعمال کو ہم سے چھپایا اور ہمیں اس سے آگاہ نہیں کیا۔ بدعت اختیار کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نعوذ باللہ احکامِ الٰہی کو لوگوں تک نہ پہنچانے اور اللہ تعالےٰ کے حکم کو بجا نہ لانے کے الزام کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ کیونکہ آیتِ قرآنی ہے:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ

(المائدہ: ۶۷)

یعنی "اے نبیؐ جو کچھ ہم نے آپ پر نازل کیا ہے وہ سب کچھ لوگوں تک پہنچا دیجئے"

مگر بدعت پر عمل کر کے ہم یہ ثابت کر رہے ہیں کہ یہ عمل ہے تو اللہ کو پسند مگر نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم الٰہی "بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ..." الخ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہمیں بتایا نہیں۔ اس کے علاوہ بدعت اختیار کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر غلط بیانی کا الزام بھی عائد ہوتا ہے کیونکہ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

۵ إِنَّهُ لَمْ يَكُنْ نَبِيًّا قَبْلِي إِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَيْهِ أَنْ يَدُلَّ أُمَّتَهُ عَلَى خَيْرِ مَا يَعْلَمُهُ لَهُمْ (مسلم) یعنی مجھ سے پہلے جو بھی نبی آیا اس پر ضروری تھا کہ وہ اپنی امت کو ہر وہ بات بتا دے جو اس کے علم میں ان کے لئے اچھی ہے۔

مگر بدعت اختیار کرنے سے یہ بات جھوٹی ثابت ہوتی ہے کیونکہ ہر بدعت کو خیر اور اچھی بات سمجھ کر ہی کیا جاتا ہے جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کے اچھا ہونے کے باوجود ہمیں اس کا پتہ نہیں دیا۔ گویا آپ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ (نعوذ باللہ من ذلک)

بدعت کی ایک خرابی یہ بھی ہے کہ قیامت کے دن بدعتی لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حوضِ کوثر پر آنے سے روک دیا جائے گا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اہلِ بدعت کے روک دیئے جانے کی وجہ یہ بتائی جائے گی کہ انہوں نے دین میں طرح طرح کی بدعتیں نکال لی تھیں تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے کہ "دُور کرو دور کرو ان لوگوں کو جنہوں نے دین کو (بدعتوں کی وجہ سے) بدل دیا تھا (بخاری) اس سے بڑھ کر بدعتی لوگوں کی بدنصیبی اور کیا ہوگی۔

بدعت کی ایک بہت بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ اس کے مرتکب کو کبھی اس کے چھوڑنے

(باقی صفحہ ۳۶ پر)

سیدنا خلیل اللہ کا گھرانہ ـــــ ایسا تھا کہ ہنوز اس گھر میں اولاد نہ تھی ـــــ محض اہلبیہ تھیں ـــــ اُن کے تعجّب و استعجاب پر کہ بڑھاپے میں اولاد کیوں کر ہوگی ـــــ ؟ فرشتوں نے بطور خاص " اھل البیت " کہہ کر انہیں مخاطب کیا اور کہا کہ اولاد بخشنا اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے ـــــ تو اس کی رحمت سے تعجّب کیوں ؟

گویا یہ آیت اس معاملہ میں بڑی واضح ہے کہ " اھل البیت " سے مراد بنیادی طور پر " بیوی " ہوتی ہے ۔

دوسرا مقام " سورۃ الاحزاب " کا ہے ـــــ آیت ۳۳ ـــــ یہ آیت بطورِ خاص حضور اقدس محمد عربی صلوات اللہ تعالیٰ علیہ وسلامہ کی ازواجِ مطہرات سے متعلق ہے ۔ ترجمہ ملاحظہ فرمائیں ۔

" اور اپنے گھروں میں بیٹھی رہو، اور گزشتہ زمانۂ جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو، اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو، اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کرو، اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے کہ اے " اس گھر والو ! "، تم سے ناپاکی دور کرے اور تمہیں خوب پاک کرے ۔ "

(ترجمہ مولانا احمد علی لاہوری)

اس آیتِ کریمہ میں بھی بہت صاف لفظوں میں نبیِّ مکرّم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ازواجِ مطہّرات کو " اھل البیت " کے عنوان سے یاد فرمایا گیا ـــــ اس کی مزید تشریح اس آیت سے ماقبل کی ۵ اور مابعد کی ایک آیتِ کریمہ کو ساتھ ملا کر پڑھنے سے خوب سامنے آسکتی ہے ۔

ایک مرحلہ پر رسولِ مکرّم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ازواجِ مطہّرات نے خرچ کے معاملہ میں کسی قدر اضافہ کی درخواست کی ـــــ ظاہر ہے کہ اپنے عظیم خاوند سے ایسی درخواست نہ حرام تھی نہ مکروہ ـــــ لیکن نبیِّ مکرّم کے گھرانہ سے اللہ تعالیٰ کو جو تعلق خاص تھا، اس کے لحاظ سے پیغمبرِ اسلام کی ازواجِ مطہّرات کو مخاطب کر کے کہا گیا ـــــ مفہوم یہ ہے :

" دنیوی زندگی کی سہولت مقصود ہے تو وہ ممکن ہے لیکن اس گھر سے رخصت

ہونا پڑے گا۔" (آیت ۲۸)

"اور اگر انہی حالات پر قناعت ممکن ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی خوشنودی مقصود ہے تو سبحان اللہ ـــــ اجر ہی اجر ہے۔"

(آیت ۲۹)

"اس پاکیزہ گھر کی ملکہ ہونے کے ناطہ سے تم سے گناہ سرزد ہوا تو عذاب دوگنا" ـــــ اور (آیت ۳۰)

"اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی تابعداری میں زندگی گذرے گی تو اجر بھی دہرا اور 'رزقِ کریم' بھی خوب ملے گا۔" (آیت ۳۱)

پھر آیت ۳۲ میں یوں خطاب وارشاد ہے۔

"اے نبیؐ کی بیویو! تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتی رہو تو دبی زبان سے بات نہ کہو کیوں کہ جس کے دل میں مرض ہے وہ طمع کرے گا (بلکہ تم) بات معقول کہو؛"

بعد ازاں آیت ۳۳ ہے جس کا ترجمہ پہلے گزر چکا اور اس سلسلہ کی آخری آیت ۳۴ ہے جس میں ہے:

"اور تمہارے گھروں میں جو اللہ تعالیٰ کی آیتیں اور حکمت کی باتیں پڑھی جاتی ہیں انہیں یاد رکھو، بے شک اللہ تعالیٰ رازداں اور خبردار ہے۔"

(ترجمہ مولانا احمد علی لاہوری)

قرآن مجید ـــــ جو اللہ تعالیٰ کی کتاب آخری ہے ـــــ انسانوں کے لئے صحیفہ ہدایت ـــــ روگی دلوں کے لئے مسیحا اور نسخہ شفاء، اس پر سیدھے سادے طریقہ سے غور کرنے والا ان آیات سے خوب سمجھ سکتا ہے کہ "اھل البیت" فی الحقیقت ازواجِ مطہرات ہی ہیں۔

ہمارے تفسیری ذخیرہ میں "کشّاف" کا مقام اہلِ نظر سے مخفی نہیں ـــــ کلاسیکل تفسیری کتاب ہے۔ صاحبِ کشّاف فرماتے ہیں۔

وفی ھذا دلیل بین علی اَنّ نساء النبی صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم من اھل بیتہ ثم ذکرھن ان بیوتھن مھابط الوحی ..... الخ

(کشّاف : ج ۳ ص ۲۶۰ دارالمعرفۃ بیروت)

یعنی اس آیتِ کریمہ میں دلیل ہے کہ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بیویاں "اہلِ بیت" ہیں پھر انہیں یاد دلایا گیا کہ ان کے گھر وحی اترنے کی جگہ ہیں۔

اسی طرح القرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ ـــــ اپنی معروف و معتبر تفسیر میں فرماتے ہیں:

"اہلِ علم کا اس میں اختلاف ہے کہ "اہلِ بیت" کون ہیں؟"

جناب عکرمہ، عطاؒ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھما ورحمھما اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں ـــــ

"وہ محض ازواجِ مطہرات ہیں، کوئی مرد اس میں شریک نہیں ـــــ"

ان حضرات کا خیال ہے کہ "بیوت" سے مراد (اور یہ بالکل صحیح خیال ہے) پیغمبرِ اسلام صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے گھر ہیں (ج ۴ ص ۱۸۲ ـ احیاء التراث العربی بیروت)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھما جیسے "حِبْرِ امّت" "ترجمان القرآن" کی بات معمولی نہیں ـ یہ بات بے حد وقیع ہے اور بلاشبہ قرآن کا منشاء یہی ہے ـ

باقی ایک فرقہ ـــــ بطور خاص کلبی، اس سے سیّدنا علی، فاطمہ، حسن، حسین رضی اللہ تعالیٰ عنھم کو ہی مراد لیتے ہیں ـ (قرطبی ـ حوالہ بالا)

ظاہر ہے کہ یہ نقطہ نظر صریحاً غلط ہیں ـــــ تبعاً یہ حضرات شامل ہو سکتے ہیں، جس کی بنیاد ایک روایت ہے جس کی نسبت روایت ام المؤمنین سیّدہ اُمّ سلمہ رضی اللہ عنھا کی طرف ہے ـــــ اس روایت کو حضرت الامام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا لیکن حضرت الامام نے اس کو "حدیثِ غریب" قرار دیا ـــــ اہلِ علم جانتے ہیں کہ فنّی اعتبار سے اس روایت کا کیا درجہ ہے؟

وہ روایت یہ ہے ـــــ خلاصہ ملاحظہ فرمائیں

"کہ سیّدہ ام سلمہؓ کے بقول حضور اکرم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم میرے گھر میں تھے

جب یہ آیت نازل ہوئی آپؐ نے جناب علی، فاطمہ، حسن اور حسین کو بلا کر چادر کے نیچے جمع کر لیا اور فرمایا یہ میرے اہل بیت ہیں ـــــ اے اللہ ان سے ناپاکی دور کر دے، انہیں پاک بنا دے۔ سیّدہ کے بقول انہوں نے جب اپنے متعلق پوچھا ـــــ کہ میں اہل بیت میں شامل ہوں؟ تو فرمایا:

اَنْتِ عَلٰی مَکَانِكِ وَ اَنْتِ عَلٰی خَیْرٍ

تم تو ہو ہی ـــــ اور تمہارا کیا تم تو بہتری کے ساتھ متّصف ہو۔"

یہ روایت جیسا کہ عرض کیا گیا ـــــ ضعیف ہے ـــــ اس سے زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر اقدسؐ نے اپنے چھوٹے داماد، چھوٹی صاحبزادی اور دو نواسوں کو چادر میں لے کر انہیں اس لقب سے سرفراز فرمایا ـــــ ان کے لئے دعا فرمائی اور جناب امّ سلمہؓ کے سوال پر فرمایا ـــــ تمہیں کیا غم ـــــ تم تو اھل ہو، اُن کے لئے میں دعا و فریاد کر رہا ہوں۔

بعض حضرات مثلاً جناب زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ثعلبی کہتے ہیں کہ مراد نسبی اعزہ ہیں اس لئے اس میں چچا عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، دوسرے چچا اور ان کی اولاد شامل ہیں ـــــ اصل الفاظ ہیں کہ

"ہم بنو ہاشم ـــــ وہ بنو ہاشم ہیں" (قرطبی صد ۱۸۳ ج ۱۴ پر ساری بحث ہے)

اس سے کتنا پھیلاؤ ہو گیا ـــــ اہل علم پر مخفی نہیں، اس لئے اصل بات ازواجِ مطہرات والی ہی مناسب و صحیح ہے۔ صاحب قرطبی نے بعض حضرات کے اس سوال کا ذکر کیا کہ

"اگر اس سے خاص ازواجِ مطہّرات مراد ہیں تو پھر "جمع مذکّر" کی ضمیر کیوں ذکر کی گئی ـــــ ارشاد ہے، لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَهِّرَكُمْ ـــــ الخ ـــــ کہ اس میں دو مرتبہ "کُمْ" ضمیر آئی جو مَردوں کے لئے ہے عورتوں کے لئے نہیں ـــــ ازواجِ مطہّرات ہی مراد ہوتیں تو "عَنْكُنَّ" اور "لیطہّرکُنَّ" ہوتا ـــــ جواباً ارشاد فرماتے ہیں کہ کوئی شخص اپنے دوست سے پوچھے تمہارے اہل کیسے ہیں؟" تو جواباً یہ کہنا "ھُمْ بَخَیْرٍ" عام عرب محاورہ ہے۔

۵۔ دوسرے سورۂ ہود کی آیت ۷۳ بھی قابلِ غور ہے کہ اس میں سیّدنا ابراہیم کی متعیّن طور پر اہلیہ کے لئے "کُمْ" ضمیر لائی گئی۔

رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ (قرطبی ج ۱۴ ص ۱۸۳)

گویا ایسا عرب محاورہ میں ہوتا ہے"۔

ایک ہم عصر مفسّر و خادم قرآن نے "الاحزاب" کی آیت کے حوالے سے لکھا :۔

"اہل البیت" سے مراد وہ ہوں گے جن کو ایک گھر جمع کرے اور گھر میاں بی بی اور بچّوں کو جمع کرتا ہے، پس ایک شخص کے اہلِ بیت بی بی اور بچّے ہیں"۔

—— داماد کی شمولیت کو دقت طلب قرار دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ خُسر اور داماد ایک گھر کے رہنے والے نہیں ہوتے ——

اس کے بعد انہوں نے براہِ راست قرآنِ حکیم کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے لکھا :۔

"لیکن اگر ہم خود قرآن کریم پر غور کریں تو بات صاف ہو جاتی ہے، یہاں ساری ہدایات جو موجبِ تطہیر ہو سکتی ہیں، یعنی زینتِ دنیوی کا ترک کرنا، اللہ اور رسولؐ کی اطاعت، امر بالمعروف، گھروں میں ٹھہرنا، محاسن کی نمائش نہ کرنا، نماز کا قائم کرنا وغیرہ سب بیبیوں کے لئے ہیں، اور اس ٹکڑے سے پہلے بھی انہی کا ذکر ہے اور بعد میں بھی انہی کا —— لُغت کی رُو سے اہلِ بیت کا لفظ اوّل بی بی پر آئے گا ثانیاً اولاد پر، قرآن کریم میں یہ لفظ خود انہی معنوں میں آیا ہے (انہوں نے بھی سورۂ ھود کی آیت کا حوالہ دیا، جہاں اس لفظ سے مراد حضرت ابراہیمؑ کی اہلیہ ہیں) مذکر کی ضمیر کے اعتراض کو انہوں نے زبان و ادب کے لحاظ سے نہایت بودا قرار دیا —— ترمذی کی روایت کا موصوف نے ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ایک روایت میں حضرت ام سلمہ کے سوال پر آپؐ نے فرمایا :

"تو بھلائی کی طرف ہے کیوں کہ تو نبیوں کی بی بیوں میں سے ہے"۔

(بیان ص ۹۹ - ۱۰۹۸)

گویا فرمایا کہ تم تو پہلے ہی اس کا مصداق ہو، اُن کے لئے دعا کی گئی۔

جب ہم اس موضوع پر زیادہ غور کرتے ہیں تو یہ سامنے آتا ہے کہ

الاھل - اھل الرجل واھل الدار ـــــ کسی شخص کے متعلقین یا گھر والے
(لسان بذیل مادہ)

"صاحب محیط" کی رائے میں عبرانی زبان میں "اھل" کے مادے سے "اوھل" (Ohel) کے معنی خیمہ کے ہیں :

گویا ـــــ وہ لوگ جو کسی کے ساتھ ایک ہی خیمے میں رہتے ہوں ۔

(دائرۃ المعارف الاسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ص ۵۷۵ ج ۲)

"صاحب لسان" کے بقول اہل بمعنی سزاوار اور مستحق بھی آتا ہے ـــــ نیز انہی کی رائے میں "اھل البیت" سے مراد ازواجہا وبناتہ وصھرہ ہیں یعنی آپؐ کی بیویاں، صاحبزادیاں اور داماد!

تاہم جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ داماد کی شمولیت کا معاملہ بہت کھینچا تانی کا ہے ـــــ "صاحب محیط" کی رائے ہے :

کہ اھل سے بالخصوص بیوی مراد ہے ـــــ (اور یہی اصل ہے)

پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ایک قابل قدر علمی کارنامہ "اردو دائرہ معارف اسلامیہ" میں "اھل البیت" کے ضمن میں جو مقالہ ہے اس کے بعض ضروری حصے لائق مطالعہ ہیں ـــ انہیں ملاحظہ فرمالیں ۔

"علماء کے نزدیک "اھل البیت" سے مراد پیغمبر اسلام کا گھر ہے جس میں ازواج مطہرات سکونت پذیر تھیں ـــــ چنانچہ "قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ" میں ان حجروں اور مختصر کمروں کا ذکر ہے جن میں آپؐ کی ازواج مطہرات رہتی تھیں ۔
(ج ۳ : ص ۵۷۶)

ابن ابی حاتم اور ابن عساکر نے حضرت عکرمہ اور ابن مردویہ نے بحوالہ حضرت سعید بن جبیر اور حضرت عبداللہ بن عباس نقل کیا :

"کہ اھل البیت والی آیت احزاب ازواج مطہرات کے حق میں نازل ہوئی"
(تفسیر فتح القدیر ج ۴ ص ۲۷۰ مطبوعہ مصر)

امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صحیح میں قرآن کریم کی سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۳ (اے مومنو! تم نبیؐ کے گھر "بیوت النبی" میں نہ داخل ہو) کے ضمن میں لکھا ۔

"نبی خاتم و امام معصوم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سیدتنا و مخدومتنا عائشہ صدیقہ حمیرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر تشریف لے گئے تو فرمایا:

السلام علیکم اھلَ البیت ورحمۃ اللہ

جواب میں انہوں نے عرض کیا:

وعلیکُ السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ"

سیدنا علی، فاطمہ، حسن، حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو جس طرح نبی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے چادر میں لے کر دعا کی ـــــ اسی طرح کی روایت سگے چچا سیدنا عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے بچوں کے لئے بھی ہے۔ (اردو دائرہ معارف: (ج ۲ ص ۵۷۸)

اور پہلے بھی یہ گذرا کہ بعض حضرات تمام ترنبو ہاشم کو شامل کرتے ہیں ـــ جہاں تک شمولیت کا تعلق ہے۔ اس میں روایات کا حوالہ سے کئی ایک کو شامل کیا جا سکتا ہے ـــ حضرت المخدوم سیدنا سلمان الفارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے آخر روایت "سلمان اھل بیت منّا" کے الفاظ موجود ہیں لیکن بنیادی طور پر قرآن عزیز کو سامنے رکھا جائے اور "الاحزاب" کے رکوع ۴ ـــ جس کی آیت کے حوالہ سے بحث ہوئی۔ ـــ کے پورے مضمون پر غور کیا جائے تو "قرآنی اھل البیت" کا اوّلین اور بنیادی مصداق ـــ حضور اکرم، محمد الامین صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ہی ہیں جو کائنات انسانی کی خواتین کی سرخیل و سرگروہ ہیں ـــ جنھیں ایک خاص پس منظر میں "سورۃ النّور" کے تیسرے رکوع کے آخر میں "الطیّبات" کے پاکیزہ ترین لقب و خطاب سے یاد کیا گیا۔ ـــ جو بلاشبہ ان ہی عفت مآب خواتین کے سر پر سجتا ہے ـــ جنھیں قرآن عزیز نے "امّت مسلمہ" کی مائیں قرار دیا (الاحزاب: ۶)

یہی سبب ہے کہ رواں صدی میں قرآن کریم کے عجیب و غریب الہامی اور وجدانی نکات فضا میں بکھیرنے والے صاحب درد عالم السید عطاء اللہ شاہ بخاری ـــ ان عفت مآب خواتین کو "روحانی" نہیں "قرآنی مائیں" قرار دیتے کہ روحانیت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ قرآنی مائیں ہونے کا شرف انہیں ہی حاصل ہے۔

لغات و اعرابِ قرآن (۸)

پروفیسر حافظ احمد یار

سورۃ البقرہ (۳)

(ملاحظہ! کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) کا ایک خاص طریقہ اختیار کیا گیا ہے جس کی وضاحت مقدمہ (حکمت قرآن فروری ۸۹ء) میں کر دی گئی تھی۔ جن حضرات کی نظر سے وہ شمارہ نہیں گزرا۔ ان کے لیے دوبارہ اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔ [قطعہ بندی کے لیے سب سے پہلا دائیں طرف والا ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد اگلا دائیں طرف والا قطعہ نمبر (جو اس سورۃ میں سے زیر مطالعہ ہے) کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد تیسرا نمبر بحث اللغہ کے لیے ۱، بحث الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ لکھا گیا ہے مثلاً ۱:۳:۲ کا مطلب ہے سورۃ الفاتحہ کے تیسرے قطعہ میں بحث الاعراب]۔

۲:۳ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ
وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ
هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿٤﴾

۲:۳:۱ اللغۃ

"وَ" "اَلَّذِيْنَ" اور "يُؤْمِنُوْنَ" پر بات ہو چکی ہے۔ دیکھیے گزشتہ دو آیات (۲:۲:۱) میں

۲:۳:۱(۱) [بِمَا] میں باء الجر (بِ) تو فعل "یؤمنون" کا صلہ ہے۔ اور "مَا" موصولہ ہے[1] بمعنی "جو کچھ کہ"۔ اس طرح "بِمَا" کا یہاں لفظی ترجمہ

---

[1] "مَا" کے مختلف استعمالات کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ دیکھیے ۲:۲:۱(۵)

"اس کے ساتھ جوکہ" کی بجائے اردو محاورے کے مطابق "اس پر جوکہ" کرنا زیادہ موزوں ہے اور اکثر مترجمین نے یہی کیا ہے۔ تاہم خیال رہے کہ عربی میں "ایمان لانا" کے لئے "آمن علی......" کہنا بالکل غلط ہے[1]۔ انگریزی میں اسی "بِ" کا ترجمہ "IN" کی صورت میں ہوگا یعنی "TO BELEIVE IN" یہاں WITH یا AT یا ON کا استعمال بالکل غلط ہوگا۔ ہر زبان کے یہ حروفِ جارہ یا صلات یا PRE-POSITIONS یکساں استعمال نہیں ہوتے۔ عربی افعال کے "صلات" کا اردو ترجمہ کرتے وقت اس نکتہ کو مدنظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔

۲:۳:۱(۲) [اُنْزِلَ] کا مادہ "ن ز ل" اور وزن "اُفْعِلَ" ہے۔

اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد نَزَلَ يَنزِلُ نُزُولًا (باب ضرب سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں: "اترنا"، "نیچے آنا"، "اتر آنا"، "نازل ہونا"۔ یعنی یہ فعل ہمیشہ لازم ہوتا ہے۔ اگرچہ کبھی ـــ فعل "دخَل" کی طرح ـــ اس کا مفعول فیہ ساتھ ہی (بنفسہ) مذکور ہوتا ہے۔ اور کبھی "باء (ب)" یا "فی" کے صلہ کے ساتھ بھی آتا ہے۔ مثلاً "نزل المکانَ و بالمکانِ و فی المکانِ"..... میں اترنا یا آنا" تاہم مؤخر الذکر استعمال ("فی" کے ساتھ) قرآن کریم میں نہیں آیا ہے۔ اس فعل (ثلاثی مجرد۔ نزل) سے مختلف صیغے قرآن کریم میں چھ (۶) جگہ آئے ہیں جن کی وضاحت اپنی اپنی جگہ ہوگی۔

● "اُنْزِلَ"۔ اس مادہ (نزل) سے باب اِفعال کا فعل ماضی مجہول (یعنی للمفعول) کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ اس باب سے یہ فعل "اَنزل..... یُنزِل اِنزالاً" عموماً متعدی اور بغیر صلہ کے آتا ہے۔ اور اس کے معنی ہوتے ہیں: "......کو نازل کرنا[2]"، "......کو اتارنا"۔ اردو محاورے میں فعل "اتارنا یا نازل

---

[1] فعل "آمن" اور اس کے صلہ کی بحث بھی پہلے ہو چکی ہے دیکھئے ۲:۲:۱(۱)

[2] اس لفظ "نازل" کے اصل معنی تو ہیں "نازل ہونے والا۔ اترنے والا"۔ تاہم اردو میں "نازل ہونا یا کرنا" "اترنا یا اتارنا" کے معنوں میں مستعمل ہے۔

کرنا" کا فاعل تو "نے" کے ساتھ مذکور ہوتا ہے، مگر مفعول سے پہلے "کو" لگانا ہمیشہ ضروری نہیں ہوتا۔ مثلاً کہہ سکتے ہیں "اس نے قرآن کو اُتارا" یا "اس نے قرآن اُتارا/نازل کیا"۔ یہاں فعل مجہول کا ترجمہ "اُتارا گیا" یا "اُتاری گئی (کتاب)" ہونا چاہیئے اور اردو کے کم از کم تین مترجمین نے اسی طرح (مجہول) کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔

● تاہم بہت سے مترجمین نے "مَا اُنْزِلَ" کا اردو ترجمہ "جو اترا/نازل ہوا" یا "جو کتاب اتری/نازل ہوئی" سے کیا ہے۔ یعنی فعل "متعدی مجہول" کا ترجمہ "لازم معروف" (نَزَلَ) کی طرح کر دیا ہے۔ اسے اردو محاورے کی بنا پر مفہوم ادا کرنے کے لئے ہی درست سمجھا جا سکتا ہے۔ ورنہ یہ اصل الفاظِ نص (عبارت) سے ضرور ہٹا ہوا ہے۔ کیونکہ اس میں نائب الفاعل کو (جو دراصل مفعول ہوتا ہے) فاعل بنا دیا گیا ہے۔

۲:۳:۱(۳) [اِلَيْكَ] یہ حرف الجر "اِلٰی" اور ضمیر مجرور "كَ" کا مرکب ہے۔ اس ترکیب میں اسے "اِلَاكَ" پڑھنے کی بجائے یائے لینہ کے ساتھ "اِلَيْكَ" پڑھتے ہیں [دیکھئے سورۃ الفاتحہ میں "عَلَيْهِمْ" کا بیان ۱:۶:۱ (۳)] یہاں بھی صرف چند مترجمین نے "اِلَيْكَ" کا درست لفظی ترجمہ "تیری/آپ کی/تمہاری/طرف" سے کیا ہے۔ بیشتر نے اس کا ترجمہ "آپ/تجھ/تم/پر" کر دیا ہے جو ظاہر ہے "اِلٰی" کا نہیں بلکہ "عَلٰی" کا ترجمہ ہے۔ مفہوم درست سہی مگر اس کے لئے اصل لفظی ترجمہ سے ہٹنے کا کوئی تقاضا بھی تو موجود ہونا چاہیئے۔

[وَمَا اُنْزِلَ] یہ پہلے (مذکورہ بالا) "بِمَا اُنْزِلَ" کی طرح ہے۔ یہاں بھی بیشتر مترجمین نے "اُنْزِلَ" کا ترجمہ "نَزَلَ" کی طرح کر دیا ہے جو محاورے کی کسی سخت مجبوری کے بغیر قرآن کے الفاظ (نص) سے بظاہر تجاوز ہی بنتا ہے اگرچہ اس سے مفہوم اور معنی میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی۔

۲:۳:۱(۴) [مِنْ قَبْلِكَ] یہ "مِن" (حرف جار بمعنی "سے") + "قَبْلِ" (ظرف بمعنی "پہلے") + "كَ" (ضمیر مجرور بمعنی "تجھ") کا مرکب ہے۔ ان (تین کلمات) میں سے لفظ "قَبْل" کا مادہ "ق ب ل" اور وزن "فَعْلٌ" ہے۔

(اگرچہ تنوین کے ساتھ اس کا استعمال شاذ ہے)۔ یہ (ق ب ل) ایک ایسا مادہ ہے جس سے ثلاثی مجرّد اور مزید فیہ کے کئی ابواب سے متعدد افعال (کے صیغے) قرآن کریم میں استعمال ہوئے ہیں۔ تاہم یہ فعل والی بحث تو ہم اس مادہ سے کسی فعل کے استعمال کے موقع پر کریں گے ـــــ (اور یہ موقع البقرہ : ۴۸ میں پہلی دفعہ آئے گا)۔ البتہ لفظ "قبل" کے استعمال کے متعلق چند امور کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے :-

(۱) لفظ "قَبل" کے معنی "پہلے" ("بعد" کی ضد) ہیں - یہ لفظ ظرف ہے کیونکہ اس میں وقت یا جگہ (زمان یا مکان سابق) کے معنی موجود ہیں اور یہ عموماً مضاف ہو کر آتا ہے۔ اپنے مضاف الیہ سے پہلے یہ ہمیشہ منصوب (قبلَ) آتا ہے۔ مثلاً "قبلَ الفجر" (فجر سے پہلے) یا قبلَ المسجد (مسجد سے پہلے) (۲) اور اگر اس سے پہلے کوئی حرف جار آجائے (جو عموماً "مِنْ" لگتا ہے) تو یہ مضاف (قَبل) مجرور ہو جاتا ہے مثلاً "مِنْ قَبْلِ الْفَجْرِ" (معنی وہی "فجر سے پہلے" ہی رہے گا)۔ (۳) اور اگر اس (قبل) کا مضاف الیہ مذکور نہ ہو (یعنی یہ نہ بتایا گیا ہو کہ کس سے پہلے) تو یہ لفظ (قبلُ) مبنی بر ضمہ (ہر حالت میں ضمہ (ـُـ) پر ختم ہونے والا) ہوتا ہے چاہے شروع میں حرف الجر بھی کیوں نہ ہو ـــــ بلکہ اس صورت میں (مضاف الیہ مذکور نہ ہونے کی صورت میں) اس سے پہلے "مِن" ضرور آتا ہے ـــــ مثلاً "مِنْ قبلُ" ـــــ اس صورت میں اس کا اردو ترجمہ "پہلے ہی" یا "پہلے بھی" سے بھی کیا جاتا ہے۔

● لفظ "قبل" کے استعمال کی یہ تینوں (مذکور بالا) صورتیں قرآن کریم میں بکثرت (کل ۲۴۲ دفعہ) استعمال ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ عربی زبان میں کبھی ـــــ خاص شرائط کے ساتھ ـــــ یہ لفظ تنوین نصب کے ساتھ یعنی "قبلاً" بھی استعمال ہوتا ہے تاہم اس کا یہ استعمال قرآن کریم میں نہیں آیا ـــــ اردو میں چونکہ لفظ "قبل" اپنے عربی معنی (بعد کی ضد) میں مستعمل ہے مثلاً "قبلِ ظہر" یا "قبل از وقت" میں ـــــ اس لئے "مِنْ قبلِكَ" کا ترجمہ "آپ سے قبل" اس اصول کی بنا

پر زیادہ مناسب ہے کہ : " اگر قرآن کریم کا کوئی لفظ اردو میں اپنے اصل معنوں کے ساتھ مستعمل اور متعارف ہو یا بلحاظ اشتقاق اس (قرآنی لفظ) سے قریب تر لفظ موجود ہو تو اس کا اردو ترجمہ اسی لفظ کے ساتھ کرنا زیادہ موزوں اور بہتر ہے "۔ تاہم عوام کے لئے شاید "قبل" کی بجائے "پہلے" کا لفظ زیادہ سہل اور زیادہ مانوس ہے۔

۲ : ۳ : ۱ (۵) [وَبِالْاٰخِرَةِ] دراصل " وَ " (واو عاطفہ بمعنی " اور ") + بِ (باء الجر بمعنی "کے ساتھ/پر") + الاخرۃ (جس کے معنی ابھی بیان ہونگے) کا مرکب ہے ۔ " الاٰخِرۃ " کا لام تعریف ہٹا دیں تو اصل لفظ " آخرۃ " نکل آتا ہے۔ [یہ لفظ عام عربی املاء (رسم معتاد) ـــــ بلکہ اردو میں بھی اسی طرح " آ " کے ساتھ لکھا جاتا ہے ۔ اس کے قرآنی ضبط پر بات ابھی آگے " الضبط " کی بحث میں ہو گی]۔ اس لفظ (آخرۃ) کا مادہ " أ خ ر " اور وزن " فاعِلَۃٌ " ہے ۔ یہ " آ " دراصل ء + ا = " فا " ہے یعنی یہ " الف " بنائی (اشتقاق کا) ہے کسی " و " یا " ی " سے بدل کر نہیں بنا ۔

- اس مادہ (أخر) سے فعل ثلاثی مجرّد عربی میں استعمال ہی نہیں ہوتا ۔ البتہ مزید فیہ کے بعض ابواب (تفعیل ، تفعّل اور استفعال) سے بعض افعال اور کچھ دیگر مشتقات قرآن کریم میں آئے ہیں جن کا بیان اپنی اپنی جگہ پر آئے گا ۔ " آخرۃ " اپنے وزن کے لحاظ سے مادہ " أ خ ر " سے اسم الفاعل (آخِرٌ) کا صیغۂ تانیث ہے ۔ یہ لفظ اس لحاظ سے قابلِ توجہ ہے کہ اسم الفاعل (بروزن " فاعل ") تو ہمیشہ فعل ثلاثی مجرد ہی سے آتا ہے اور اس مادہ (أ خ ر) سے فعل ثلاثی مجرد استعمال ہی نہیں ہوتا جس کے معنی " پیچھے یا اخیر پر آنا " ہوں ۔ تاہم اس کے اسم الفاعل میں یہی معنی موجود ہیں ۔ یعنی اس کے اس صیغۂ تانیث کے معنی ہیں ۔ " اخیر پر / پیچھے آنے والی " ۔ چونکہ اردو میں لفظ " آخِر " (بمقابلۂ اوّلی) اپنے عربی معنوں میں مستعمل ہے ۔ اس لئے " آخرۃ " کا ترجمہ " (سب سے) آخر پر آنے والی " (بمقابلہ اُولٰی) بھی کیا جا سکتا ہے ۔
- اپنے معنی کے لحاظ سے لفظ " الآخرۃ " صفت (نعت) ہے ۔ اس

پر زیادہ مناسب ہے کہ : " اگر قرآن کریم کا کوئی لفظ اردو میں اپنے اصل معنوں کے ساتھ مستعمل اور متعارف ہو یا بلحاظ اشتقاق اس (قرآنی لفظ) سے قریب تر لفظ موجود ہو تو اس کا اردو ترجمہ اسی لفظ کے ساتھ کرنا زیادہ موزوں اور بہتر ہے "۔ تاہم عوام کے لئے شاید "قبل" کی بجائے "پہلے" کا لفظ زیادہ سہل اور زیادہ مانوس ہے۔

۲ : ۳ : ۱ (۵) [وَبِالْاٰخِرَةِ] دراصل " وَ " (واو عاطفہ بمعنی " اور ") + بِ (باء الجر بمعنی "کے ساتھ/پر") + الاخرۃ (جس کے معنی ابھی بیان ہونگے) کا مرکب ہے۔ " الاٰخِرۃ " کا لام تعریف ہٹا دیں تو اصل لفظ " آخرۃ " نکل آتا ہے۔ [یہ لفظ عام عربی املاء (رسم معتاد) ـــــ بلکہ اردو میں بھی اسی طرح " آ " کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ اس کے قرآنی ضبط پر بات ابھی آگے " الضبط " کی بحث میں ہو گی]۔ اس لفظ (آخرۃ) کا مادہ " أ خ ر " اور وزن " فاعِلَۃٌ " ہے۔ یہ " آ " دراصل ء + ا = " فا " ہے یعنی یہ " الف " بنائی (اشتقاق کا) ہے کسی " و " یا " ی " سے بدل کر نہیں بنا۔

- اس مادہ (أخر) سے فعل ثلاثی مجرّد عربی میں استعمال ہی نہیں ہوتا۔ البتہ مزید فیہ کے بعض ابواب (تفعیل، تفعّل اور استفعال) سے بعض اَفعال اور کچھ دیگر مشتقات قرآن کریم میں آئے ہیں جن کا بیان اپنی اپنی جگہ پر آئے گا۔ " آخرۃ " اپنے وزن کے لحاظ سے مادہ " أ خ ر " سے اسم الفاعل (آخِرَۃٌ) کا صیغۂ تانیث ہے۔ یہ لفظ اس لحاظ سے قابلِ توجہ ہے کہ اسم الفاعل (بروزن " فاعل ") تو ہمیشہ فعل ثلاثی مجرد ہی سے آتا ہے اور اس مادہ (أ خ ر) سے فعل ثلاثی مجرد استعمال ہی نہیں ہوتا جس کے معنی " پیچھے یا اخیر پر آنا " ہوں۔ تاہم اس کے اسم الفاعل میں یہی معنی موجود ہیں۔ یعنی اس کے اس صیغۂ تانیث کے معنی ہیں۔ " اخیر پر/پیچھے آنے والی "۔ چونکہ اردو میں لفظ " آخِر " (بمقابلۂ اوّل) اپنے عربی معنوں میں مستعمل ہے۔ اس لئے " آخرۃ " کا ترجمہ " (سب سے) آخر پر آنے والی " (بمقابلہ اُولیٰ) بھی کیا جا سکتا ہے۔
- اپنے معنی کے لحاظ سے لفظ " الآخرۃ " صفت (نعت) ہے۔ اس

لئے یہاں ایک موصوف محذوف یا مقدّر (UNDERSTOOD) ہے۔ یعنی " الدار الاخرۃ " یا " الحیاۃ الآخرۃ " یا " النشأۃ الآخرۃ " (آخری پیدائش) یعنی مرنے کے بعد آنے والی زندگی۔ قرآن کریم میں یہ لفظ ہر جگہ معرّف باللام ہی آیا ہے۔ جس میں " لام " عہد کا ہے یعنی وہ آخری زندگی جس پر ایمان لانا دین اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے اور جس کا ذکر (قرآن کریم میں) بار بار آیا ہے۔

● اور اپنے ان (مذکورہ بالا) معنوں کے لحاظ سے یہ لفظ " الآخرۃ " ایک اسلامی اصطلاح ہے جو اسلام نے عربی زبان کو دی ہے اور جس کے مفہوم اور معنی کی قرآن کریم نے تفصیل اور تکرار کے ساتھ وضاحت کر دی ہے۔ [اور " آخرۃ " کے ان معنوں کو کفارِ مکّہ بھی سمجھتے تھے اور اسی لئے وہ (ان معنوں کے لحاظ سے ہی) آخرت کا انکار کرتے تھے یعنی آخرت کی زندگی۔ مرنے کے بعد آنے والی زندگی کے ہی تو وہ منکر تھے] - اور اپنے ان ہی — اسلامی اصطلاحی معنوں میں یہ لفظ اردو، فارسی اور ترکی میں " آخرت " کی املاء کے ساتھ مستعمل ہے۔ اور بہت سی اسلامی زبانوں میں اس کا لفظی ترجمہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اردو فارسی کے تمام مترجمین نے اس کا ترجمہ " آخرت " ہی کیا ہے۔

● قرآن کریم میں لفظ " الآخرۃ " ایک سو پندرہ (۱۱۵) جگہ آیا ہے۔ مفرد بھی اور ترکیب توصیفی یا اضافی کے ساتھ بھی اور قریباً ہر جگہ اس کے یہی اصطلاحی اسلامی معنی مراد ہیں۔ ماسوائے ایک دو مقام کے جہاں سیاقِ کلام اصطلاحی کی بجائے لفظی معنوں کا تقاضا کرتا ہے۔

مثلاً ایک جگہ (ص : ۷) پر " الملّۃ الآخرۃ " (آخری ملّت) کی ترکیب آئی ہے اور دوسری جگہ (الاسراء : ۱۰۴) پر " وعد الآخرۃ " کی ترکیب آئی ہے جس میں لفظی اور اصطلاحی دونوں معنی کی گنجائش موجود ہے۔ ان کی وضاحت تو اپنی اپنی جگہ پر ہی کی جائے گی یہاں " الآخرۃ " کے اصطلاحی معنی کے " اسلامی مسلّمات " میں سے ہونے کی یہ تفصیلی بات ہمیں اس لئے کرنا پڑی کہ بعض گمراہوں

نے اپنی اغراض کے لئے اس لفظ "آخرۃ" کو من مانے معنی پہنانے کی کوشش کی ہے اور وہ بھی قرآن کے حوالے سے (گویا بظاہر انہوں نے قرآن ہی کا "مفہوم" سمجھنے یا سمجھانے کا "فریضہ" سرانجام دیا ہے) ــــ قادیانیوں اور منکرینِ سنّت نے اپنی اپنی اغراض کے لئے یہاں (آیت زیرِ مطالعہ میں اور بعض دیگر مقامات پر بھی) "آخرت" کی اسلامی اصطلاح کے استعمال سے گریز کیا ہے۔ قادیانیوں نے تو یہاں "آئندہ ہونے والی (موعود) باتیں" مراد لی ہیں جس میں تعلیماتِ قرآن و اسلام سے بغاوت کے علاوہ لُغت و اشتقاق کے لحاظ سے بھی "پھسڈی پن" بلکہ "باطنیت" نمایاں ہے۔ منکرینِ سنّت نے اس (آخرت) کے لئے "نئی زندگی" اور "مستقبل" کے ذومعنی لفظ اختیار کئے ہیں ــــ اسلامی اصطلاحات سے اس فرار کے محرکات اور مضمرات کو جاننے کے لئے "دس من عقل" درکار نہیں ہے۔

● اور لفظ "بِالآخرۃ" میں باء الجر (بِ) اسے آگے آنے والے فعل "یوقنون" سے متعلق کرتی ہے یا اس فعل کے صلہ کے طور پر آئی ہے۔

۲ : ۳ : ۱ (۶) [**هُمْ يُوقِنُونَ**] میں "هُمْ" تو جمع مذکر غائب کی ضمیر ہے بمعنی "وہ (سب)" اور "یوقنون" کا مادہ "ی ق ن" اور وزن اصلی "یُفْعِلُوْن" ہے۔ اس کی اصلی شکل بلحاظ وزن "یُیْقِنُوْن" ہے۔ جس میں تعلیل صرفی کے قاعدہ [یائے ساکنہ ماقبل مضموم واو میں بدل جاتی ہے] کی بنا پر ــــ یا اہلِ عرب کے نطق کے مطابق ــــ ساکن یاء کو "واو" میں بدل دیا گیا ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرّد "یقِن یَیْقَن یَقَنًا (باب سمع سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہیں: "واضح اور ثابت ہونا" یعنی یہ فعل لازم ہے۔ اور اسی سے لفظ "یقین" بروزن فَعِیل بمعنی فاعل آتا ہے یعنی "واضح اور ثابت ہونے والی چیز" ــــ اور اسی ثلاثی مجرد سے کبھی صلہ کے بغیر اور کبھی "بِ" کے صلہ کے ساتھ یہی فعل بطور متعدّی بھی آتا ہے۔ مثلاً "یَقِنَ الامرَ و بالامرِ" کے معنی ہیں: "...... کا یقین رکھنا"، "...... کو یقینی (قطعی) جاننا"، "

کے بارے میں کوئی شک نہ ہونا ۔ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ (یقن) سے کوئی فعل ثلاثی مجرد کسی معنی میں کہیں بھی استعمال نہیں ہوا۔ البتہ مزید فیہ کے بعض ابواب (مثلاً اِفعال اور استفعال) سے کچھ افعال اور بعض مشتقات آئے ہیں جن کا بیان اپنی اپنی جگہ پر آئے گا۔

- " یُوقِنُونَ " اپنے وزن کے اعتبار سے اس مادہ (یقن) سے باب " اِفعال " کے فعل مضارع معروف کا صیغہ جمع مذکر غائب ہے۔ اَیْقن ...... یُوقِنُ (دراصل یُیْقِنُ) ایقاناً کے معنی بھی "...... کا یقین رکھنا" اور "...... کو یقینی (قطعی) جاننا" ہیں۔ یعنی یہ فعل متعدی ہی ہوتا ہے۔ البتہ کبھی صلہ کے بغیر اور کبھی " با " (بِ) کے صلہ کے ساتھ آتا ہے یعنی " اَیقن الامر و بالامر " ــــ قرآن کریم میں یہ فعل (ایقن) عموماً " بِ " کے صلہ کے ساتھ ہی آیا ہے (پانچ جگہ) ــــ مفعول بنفسہ کے ساتھ کہیں نہیں آیا۔ البتہ بعض مقامات پر (کُل چھ جگہ) مفعول کو محذوف کر دیا گیا ہے جو عبارت میں خود بخود سمجھا جاتا ہے۔ اس کی مثالیں آگے چل کر ہمارے سامنے آئیں گی۔

۲:۳:۲ الإعراب

[والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک و بالاخرۃ ھم یوقنون ④]

یہ آیت (۴) جو کُل دو جملوں پر مشتمل ہے سابقہ آیت (۳) پر معطوف ہے۔ چاہے اسے " المتّقین " (آیت ۲) کا بدل یا صفت قرار دیں یا الگ جملہ مانیں جس کی خبر اگلی آیت (۵) بنتی ہے۔ آیت زیرِ مطالعہ میں [والذین] میں واوِ عاطفہ (بمعنی " اور ") ہے اور " الذین " اسم موصول (جمع مذکر) ہے۔ اس (الذین سے شروع ہونے والے جملے) کا عطف بہر حال پچھلی آیت (۳) میں " الذین یؤمنون " سے شروع ہونے والے جملے پر ہے ــــ خود

وہ جملہ چاہے الگ جملہ سمجھا جائے یا " المتقین " (آیت ۲) کی صفت یا اس کا بدل سمجھا جائے [اس " الذین " (آیت ۳) کے تین ممکن اعراب کی بات بھی پہلے ہو چکی ہے ۔ دیکھئے ۲ : ۲ : ۲]۔

● یُؤْمِنُوْنَ ...... سے لے کر ...... یُوْقِنُوْنَ ۔ تک دراصل دو جملے بنتے ہیں اور یہ دونوں جملے اس (ابتداء آیت میں آنے والے) " والذین " کا صلہ بنتے ہیں ۔ اور اس "صلہ" کا نحوی یا اعرابی تجزیہ اس طرح ہے :-

[یُؤْمِنُوْن] فعل مضارع مع ضمیر فاعل مستتر " ھم " ہے اور [بما] جار مجرور (بِ + ما) ہے جس میں " ما " موصولہ ہے اور یہ جار مجرور فعل " یُؤمنون " سے متعلق ہیں ۔ یا " ب " اس فعل کا صلہ ہے ۔ ترجمہ ہوگا " ایمان رکھتے ہیں / لائے ہیں ۔ اس پر جو کہ " [اُنْزِلَ] فعل ماضی مجہول ہے جس میں نائب الفاعل ضمیر " ھو " مستتر (پوشیدہ) ہے ۔ جس کا مرجع یہی اسم موصول " مَا " ہے جس کا ترجمہ " جو کہ اتارا گیا " بھی ہو سکتا ہے ۔ اور اگر " ما " کے عموم کو مدِنظر رکھیں تو " جو کچھ بھی کہ اتارا گیا " کر سکتے ہیں [اِلَیْکَ] جار مجرور (الی + کَ) فعل " اُنزل " سے متعلق ہے ۔ اس طرح یہ پورا حصہ آیت " بِمَا اُنْزِلَ الیکَ " فعل " یُؤمنون " سے متعلق بھی ہو سکتا ہے یعنی اس میں اُن کے ایمان لانے کی وضاحت ہے کہ کس پر ایمان لائے ؟ ۔ اور اگر " بِمَا " کی " بِ " کو یُؤمنون کا صلہ سمجھیں (کیونکہ " ایمان لانا " کے معنوں میں یہ اس صلہ کے ساتھ ہی آتا ہے) تو " بما اُنزِل الیکَ " کو مفعول سمجھ کر محلاً منصوب بھی کہہ سکتے ہیں ۔ بہرحال اس (ترکیب کے فرق) سے اردو ترجمہ میں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا " یعنی یومنون بما انزل الیکَ = وہ ایمان رکھتے ہیں اس پر جو کچھ بھی کہ اتارا گیا تیری طرف "

● [وَ] عاطفہ [مَا] موصولہ جو پہلے والے مَا پر معطوف ہے گویا دراصل یہ بھی " بما " ہے ۔ [اُنْزِلَ] مثلِ سابق فعل ماضی مجہول مع ضمیر نائب الفاعل

"ھو" برائے "ما" ہے اور [مِنْ] حرف جار اور [قَبْلِكَ] مرکب اضافی ہے جس میں " قَبْلِ " مجرور بالجر (من) مضاف ہے اور "كَ" ضمیر مجرور مضاف الیہ ہے۔ اس طرح یہ حصّۂ آیت " وما انزل من قبلكَ " فعل " یؤمنون " کے مفعول (یا متعلق فعل) پر معطوف ہے یعنی " وہ ایمان رکھتے ہیں " ما انزل الیكَ " (جو کچھ بھی اتارا گیا تیری طرف) پر اور " ما انزل مِن قَبْلِكَ " (جو کچھ اتارا گیا تجھ سے پہلے) پر" ـــــ [وَبِالْاٰخِرَةِ] میں واو عاطفہ بمعنی " اور " ہے اور " بالاٰخرۃِ " جار مجرور (بِ + الاخرۃِ) ہے اور فعل " یوقنون " (جو آگے آرہا ہے) سے متعلق ہے یا اگر " باء " (بِ) کو یہاں بھی اس فعل کا صلہ قرار دیں تو مفعول بن کر محلاً منصوب بھی ہو سکتا ہے۔ [هُمْ] ضمیر مرفوع منفصل یہاں مبتدأ ہے اور [یُوقِنُون] فعل مضارع معروف جمع مذکر مطابق مبتدأ ـــــ مع ضمیر فاعل مستتر (ھم) جملہ فعلیہ ہو کر " هُمْ " کی خبر ہے۔ گویا آیت کے اس آخری حصّہ کی سادہ نثر (PARAPHRAZING) یوں بنتی ہے " وھم یوقنون بالاٰخرۃ " (وہ یقین رکھتے ہیں آخرت پر) مگر فواصل (آیت کا آخری لفظ) کی رعایت سے الفاظ کی تقدیم و تاخیر ہوئی ہے ـــــ کلمات کی یہ تقدیم و تاخیر ایک ادبی حُسن بھی پیدا کرتی ہے اور کسی خاص لفظ کے معنی پر زور اور تاکید کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ مثلاً یا " بالآخرۃ " کے پہلے لانے سے ایک طرح سے " خصوصاً آخرت پر " یا " آخرت پر بھی " کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ اکثر مترجمین نے یہاں " بالآخرۃ " کا ترجمہ " آخرت پر بھی " یا " آخرت کا بھی " اور " یوقنون " کا مصدری ترجمہ " پورا یقین رکھنا، یقین جاننا، یقینی جاننا یا یقین کرنا " سے کیا ہے جو سب ہم معنی ہیں۔

۲:۳:۲ الرسم

" والذین یومنون بما انزل الیكَ وما انزل من قبلكَ وبالاخرۃ

ھم یوقنون "۔

اس پوری آیت (۴) میں رسم عثمانی کا کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کی املاء عام قیاسی املاء ہی ہے البتہ لفظ " بالاخرۃ " کے بارے میں چند سور قابلِ ذکر ہیں :-

● اسے لکھتے وقت " بِ " کو ھمزۃ الوصل کے ساتھ ملا کر لکھتے ہیں (بالغیب کی طرح) ۔ اور لفظ " آخرۃ " (اور اس قسم کے دوسرے الفاظ میں بھی) قاعدۂ املاء یہ ہے کہ ـــــ جب ھمزۃ القطع (مفتوحہ) کے بعد " الف " آئے تو لکھنے میں ایک کو حذف کر دیا جاتا ہے اگرچہ پڑھا جاتا ہے یعنی " ءَا " کو صرف " ا " لکھا جاتا ہے[1] اس طرح مکتوبی صورت میں یہ لفظ " اخرۃ " ہی رہ جاتا ہے جسے لام تعریف کے ساتھ ملا کر لکھنے سے یہ لفظ " الاخرۃ " کی شکل اختیار کرتا ہے ۔

● مگر " لام " کے بعد آنے والا یہ الف یہاں اس " لام " کو مدّ نہیں دیتا یعنی اسے " لا " نہیں پڑھا جاتا کیونکہ یہ لام مفتوح نہیں بلکہ ساکن ہے ۔ البتہ یہ " الف " اپنے سے پہلے والے (محذوف) ھمزۃ القطع کو مدّ دیتا ہے یعنی اسے " ءَا " پڑھا جاتا ہے جسے عام عربی املاء میں " آ " لکھتے ہیں ۔ (اس کے " ضبط " پر بات آگے آرہی ہے) ۔

● اس سے پہلے " یؤمنون بالغیب " کے رسم کی بحث میں بھی ہم مختصراً لکھ آئے ہیں کہ اصل رسم عثمانی میں (یعنی مصاحفِ عثمانیہ میں) بلکہ اس زمانے (عہدِ راشدین تک) کی عام عربی تحریر میں بھی ھمزہ کے لئے کوئی علامت یا صورت مقرر نہیں تھی ۔ البتہ کسی کلمہ کی ابتداء میں آنے کی صورت میں اسے بصورت " الف " (ا) ہی لکھا جاتا تھا ـــ (اور اب بھی اسی طرح لکھا جاتا ہے) چاہے وہ ھمزۃ

---

[1] اور علماء رسم نے یہاں یہ دلچسپ بحث بھی کی ہے کہ یہاں محذوف پہلا ھمزہ (مفتوحہ) ہے ۔ یا دوسرا (الف) ہے بہرحال یہ صرف علمی بحث ہے اصل املاء پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ اگر چاہیں تو مزید بحث کے لئے دیکھئے نثر المرجان ج ۱ ص ۱۰۲ ۔

الوصل ہوتا یا ہمزۃ القطع یا ہمزۂ ممدودہ ہوتا جیسے " الذین " ، " النعمت " یا ادم (آدم) میں ـــــ کسی کلمہ کے درمیان یا آخر پر آنے والے ہمزہ کے لئے (جو قطع کا ہی ہوتا ہے) قطعاً کوئی تحریری علامت نہیں ہوتی تھی مثلاً " اَنۡبِئُوۡنِیۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ " (البقرۃ : ۳۱) کو " اںٮوٮی ٮاسما هولا " کی شکل میں لکھا گیا تھا۔ یعنی اس میں حروف کے نقطے بھی نہیں تھے۔ علاماتِ ضبط (حرکات ، سکون ، شد وغیرہ) بھی نہیں تھیں اور ہمزہ کے لئے بھی سرے سے کوئی علامت نہیں تھی۔ اس زمانے میں لوگ اپنی زبان دانی کی بنا پر ـــــ اور اس وجہ سے بھی کہ قرآن کریم کا پڑھنا محض کتابت یا تحریر پر منحصر نہ تھا بلکہ ـــــ ہر کلمہ استاد سے زبانی سُن کر (بذریعہ تلقّی وسماع) سیکھا جاتا تھا ـــــ اس کی بنا پر کلمات کو اس طرح ٹھیک پڑھ لیتے تھے جیسے ہم انگریزی میں CUT , PUT READ کی قسم کے لفظوں کا درست تلفّظ املاء (SPELLING) کی بنا پر نہیں بلکہ استاد کی زبانی تعلیم کی بنا پر جان لیتے ہیں۔

● بعد میں جب غیر عربوں کے لئے اِعجام (مشابہ حروف کو نقطوں سے متمیّز کرنا جیسے ب ، ت ، ث وغیرہ) اور ضبط (حروف پر حرکات ڈال کر ان کی آواز یا تلفّظ متعیّن کرنا جیسے " مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ " میں حرکاتِ ثلاثہ ، سکون اور شد جمع ہیں) ایجاد کئے گئے تو ہمزہ کے لئے بھی علامت مقرر کرنے کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں اس کے لئے مختلف علامات کا رواج ہو گیا۔ مثلاً آج کل مختلف ملکوں میں اس کی رائج صورتیں عموماً یہ ہیں: [ء ، ع ، ۶ ، E اور ● یا •] بڑے گول نقطے کی صورت میں ہمزۃ الوصل کے لئے سبز گول نقطہ اور ہمزۃ القطع کے لئے زرد گول نقطہ اختیار کیا جاتا تھا ـــــ اس کے بعد پڑھنے کے لئے ہمزہ کی صورت پر علاماتِ ضبط ڈالی جانے لگیں جن کا طریقہ (بعض دفعہ) قرآنی املاء کے لئے جدا اور عام عربی املاء کے لئے جُدا ہے۔ مثلاً اسی ہمزۂ مفتوحہ + الف کو عام عربی املاء میں " آ " لکھتے ہیں۔ مگر قرآن کریم میں اُسے عرب اور افریقی ممالک میں " ءَا "

"ءَا" ، "ءٓا" یا "ۡا" کی شکل میں لکھتے ہیں۔ ایشیائی ممالک میں اسے عموماً "ا" لکھتے ہیں۔ اس کی مزید وضاحت (خصوصاً اسی لفظ "بالاخرة" کے ضمن میں) آگے "الضبط" والی بحث کے تحت آئے گی۔

۲:۳:۴ الضبط

(وَالذین یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالاخرة هم یوقنون)

آیت زیرِ مطالعہ میں اختلافِ ضبط میں حسبِ ذیل امور توجہ طلب ہیں:-

(۱) همزة الوصل کی علامت ڈالنے نہ ڈالنے اور ڈالنے کی صورت میں اس کی شکل کا اختلاف۔ اس اختلاف کا اثر کلمات "الذین" اور "بالاخرة" کے ضبط میں ظاہر ہوگا۔

(۲) همزة القطع کی علامت (قطع) ڈالنے نہ ڈالنے اور ڈالنے کی صورت میں اس کی شکل کا فرق۔ ابتدائی همزة القطع (بصورت الف) پر علامتِ قطع ڈالنے کا رواج صرف عرب اور افریقی ملکوں میں ہے۔ وسطی یا آخری همزہ پر علامتِ قطع ہر ملک کے مصاحف میں ڈالی جاتی ہے البتہ اس کی شکل مختلف ہوتی ہے اس اختلاف کا اثر کلمات "یؤمنون"، "اُنزل" اور "اِلیک" میں ظاہر ہوگا۔

(۳) واو ساکنہ ماقبل مضموم پر علامتِ سکون صرف برصغیر میں ڈالی جاتی ہے۔ اس اختلاف کا مظہر "یؤمنون" اور "یوقنون" کا طریقِ ضبط ہوگا۔

(۴) یائے ساکنہ ماقبل مکسور پر علامتِ سکون صرف برصغیر میں ڈالی جاتی ہے اور اس کے ماقبل مکسور کی علامتِ کسرہ کی بجائے علامتِ اشباع (کھڑی زیر) صرف ایران اور ترکی میں ڈالتے ہیں۔ اس کا اثر یہاں صرف کلمہ "الذین" کے ضبط پر ہوگا۔

(۵) الف ساکنہ ماقبل مفتوح کے اس ماقبل حرف پر علامتِ فتحہ کی بجائے علامتِ اشباع بصورت کھڑی زبر (ـٰ) ڈالنے کا رواج صرف ایران میں ہے۔ اس کا

نمونہ کلماتِ " بِما " اور " ما " میں نظر آئے گا۔

(۶) نون ساکنہ مخفاۃ (ساکن نون جس کے بعد کوئی حرفِ اخفاء ہو) پر علامتِ سکون ڈالنے نہ ڈالنے کا فرق۔ عرب اور افریقی ملکوں میں ایسے نون کو علامتِ سکون سے خالی رکھا جاتا ہے۔ تمام مشرقی ممالک میں یہ علامتِ سکون ڈالی جاتی ہے۔ البتہ بعض جگہ اخفاء کے لئے کوئی اور علامت ساتھ بنا دی جاتی ہے۔ مثلاً چین میں ایسے نون ساکنہ کی علامتِ سکون کے اوپر تین باریک نقطے ڈال دیتے ہیں۔ پاکستانی تجویدی قرآن میں اس کے لئے ایک خاص علامتِ سکون " ۸ " تجویز کی گئی ہے۔ اس اختلاف کا اثر آیتِ زیرِ مطالعہ کے کلمات " انزل " اور " من قبلك " کے ضبط میں ظاہر ہوگا۔

(۷) نون متطرفہ (کسی کلمہ کے آخر میں آنے والے " ن ") کو اعجام (نقطے) سے خالی رکھنا یا اس کے موضع (جگہ) کا فرق۔ یہ بات صرف افریقی ممالک کے مصاحف میں ملحوظ رکھی جاتی ہے۔ اس اختلاف کا اثر کلمات " الذین " ، " یومنون " اور " یوقنون " میں ظاہر ہوگا۔

(۸) افریقی ممالک میں " ف " کو " ب " اور " ق " کو " ف " لکھنے کا فرق۔ اس کا نمونہ آپ " قبلك " اور " یوقنون " میں دیکھیں گے۔

(۹) علامتِ قلقلہ ڈالنے کا رواج کسی ملک میں نہیں ہے۔ صرف پاکستانی " تجویدی قرآن " میں اس کے لئے ایک خاص علامتِ سکون " ۸ " وضع کی گئی ہے جہاں اس کو لفظ " قبلكَ " کی " با " پر استعمال کیا گیا ہے۔

(۱۰) آیت زیرِ مطالعہ میں لفظ " باالاخرۃ " کے ضبط کے سلسلے میں دو تین امور قابلِ ذکر ہیں (۱) " بِ " کے ساتھ والا الف دراصل همزة الوصل ہے لہٰذا جن ملکوں میں علامتِ وصل (صہ) ڈالنے کا رواج ہے ان میں آپ کو اس الف پر یہ علامت (آ یا اٰ) لکھی نظر آئے گی۔ (۲) سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ " لا " یا " لا " کے بارے میں علمائے ضبط میں یہ اختلاف

ہوا کہ اس میں کونسا سرا "ل" ہے اور کون سا "ا" (الف) ہے۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ اہلِ مغرب (اندلس اور افریقی ممالک) تو "لا" کے پہلے سرے ① کو "الف" اور دوسرے سرے ② کو "ل" سمجھتے ہیں۔ اور اہلِ مشرق اس کے برعکس پہلے سرے ① کو "ل" اور دوسرے سرے ② کو "الف" سمجھتے ہیں "لا"۔ (۳) ابھی بیان ہو چکا ہے کہ "ءَ+ا" جمع ہونے کی صورت میں صرف "ا" لکھا جاتا ہے مگر اسے پڑھنے کے لئے محذوف ہمزہ مفتوحہ کو ضبط کے مختلف طریقوں سے ظاہر کیا جاتا ہے (ءَا، ءَا، ءَا یا ٥ا یا آ کی صورت میں)۔ "بالاخرة" کے لام کے بعد آنے والے "ا" (الف) کی تعیین کے فرق کی وجہ سے۔ (کیونکہ رسم تو ہر صورت میں وہی "بالاخرة" ہی ہے) — اسے پڑھنے کے لئے علامتِ ضبط مختلف طریقے پر لگتی ہیں۔ مزید یہ کہ — جیسا کہ ابھی اوپر بیان ہوا ہے۔ "اخرة" کے الف سے پہلے ہمزہ مفتوحہ ظاہر کرنے کے طریقے بھی مختلف ہیں۔ مشرقی ممالک میں اسے "أ" سے ظاہر کرتے ہیں۔ عرب ملکوں میں "ءَا" سے اور افریقی ملکوں میں اسے "٥ا" کی صورت میں لکھتے ہیں۔ (٥ سے مراد زرد رنگ کا گول نقطہ ہے) عام عربی املاء میں اسے "آ" لکھتے ہیں۔ اس اختلاف کی وجہ سے مشرقی ممالک مصاحف میں "بِالْاٰخِرَةِ" لکھتے ہیں۔ عرب ممالک کے مصاحف میں اسے "بِالْءَاخِرَةِ" اور افریقی مصاحف میں اسے "بِاءلْاخِرَةِ" یا "بِا٥لْاخِرَةِ" لکھتے ہیں جب کہ عام عربی املاء میں اسے "بِالآخِرَة" لکھا جاتا ہے۔

- اس طرح مجموعی طور پر آیت زیر مطالعہ کے کلمات کے ضبط کی مندرجہ ذیل صورتیں سامنے آتی ہیں:-

وَالَّذِيْنَ وَالَّذِينَ وَالَّذِينَ وَالَّذِينَ

يُؤْمِنُوْنَ، يُؤْمِنُونَ، يُؤْمِنُونَ، يُؤْمِنُونَ

بِمَا ، بِمَا ، بِمَا

أُنْزِلَ ، أُنْزِلَ ، أُنزِلَ ، اُءنزِلَ ، أُنزِلَ

اِلَيْكَ ، اِلَيْكَ ، إِلَيْكَ ، اِلَيْكَ

وَمَا ، وَمَا ،

أُنْزِلَ (مثل سابق)

مِنْ قَبْلِكَ ، مِنْ قَبْلِكَ ، مِن قَبْلِكَ ، مِن قَبْلِكَ

وَبِالْاٰخِرَةِ ، بِالْاٰخِرَةِ ، بِالْاٰخِرَةِ ، بِاٰلْاٰخِرَةِ

هُمْ ، هُمْ

يُوْقِنُوْنَ ، يُوْقِنُوْنَ ، يُوقِنُونَ ، يُوقِنُونَ

بقیہ: اسلامی کامعاشی نظام

سخت ہو جاتا ہے — اور آدمی بغیر دانتوں اور پنجوں کے درندہ بن جاتا ہے " لہٰذا سودی لعنت کی نفی کرکے اسلام نے دولت کی پاکی کا جو انتظام کر رکھا تھا اُس کا ذکر ابلیس اپنے مشیروں سے ان الفاظ میں کرتا ہے کہ ؎

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک وصاف

منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اور پاکئ دولت کا یہی وہ کلیہ تھا جسے طاغوت نے نہایت سفاکی کے ساتھ انسانیت کے ہاتھوں سے اچک لیا۔ مزید آگے بڑھئے اور دیکھئے معاشرتی نظامِ اسلامی میں طاغوت نے کیسی کیسی کارستانیاں دکھائیں۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم (۲۰)

خودی اور تخلیق (۷)

خدا کی تخلیق کی خصوصیات

ضروری ہے کہ کائنات کی تخلیق بھی یہی خصوصیات رکھتی ہو۔ لہٰذا کائنات کے بارے میں ہمارے ذیل کے نتائج درست ہوں گے۔

۱۔ کائنات کی ایک ابتدا تھی اور بالآخر اس کی ایک انتہا ہوگی۔

۲۔ کائنات اپنی ابتدا سے اپنی انتہا کی طرف متواتر آگے بڑھ رہی ہے اور اپنی ابتدا اور انتہا کے درمیان بہت سے درمیانی مرحلوں سے گزر رہی ہے۔

۳۔ ابتدا سے لے کر انتہا تک کائنات کے ارتقاء کا باعث کائناتی خودی کا ایک واحد مقصد یا نصب العین ہے جس کی وجہ سے اس کی تخلیق ابتدا سے لے کر انتہا تک ایک واحد غیر منقسم اور مسلسل فعل بن جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کائنات کی ہر حالت اس کی گزشتہ حالت کی ارتقائی تبدیلی سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔

۴۔ کائنات کی تخلیق کا مدّعا کائناتی خودی کے اس نصب العین کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ ایک مکمل اور خوبصورت کائنات (یعنی حسن و کمال کی انتہا پر پہنچی ہوئی نوعِ انسانی) وجود میں آئے۔ گویا اس کا مدّعا منتہائے کمال کی تخلیق ہے۔

۵۔ کائنات کے ارتقاء کے ہر مرحلہ پر کائناتی خودی کی فعلیت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے سارے ماضی کا جو حاصل اس کے سامنے ہے اسے ایک خاص سمت میں بدل دیا جائے تاکہ وہ اس کے نصب العین اور اپنے کمال کے اور قریب آجائے۔ کائنات کے ارتقاء کے کسی مرحلہ پر بھی کائناتی خودی کا مقصد یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کوئی نئی چیز پیدا کرے جو اس کی گزشتہ تخلیقی فعلیت

کے نتیجہ کے ساتھ کوئی علاقہ نہ رکھتی ہو اور اسے کالعدم یا نظر انداز کر کے اپنی جگہ بناتی ہو۔

۶۔ اگر کائنات اپنے ارتقاء کے کسی مرحلہ پر وہ صورت اختیار نہ کرے جو اس نے کی ہے تو وہ اپنے ارتقاء کے اگلے مرحلہ میں داخل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کے ارتقاء کی ہر حالت اس کی گزشتہ حالت سے پیدا ہوتی ہے اور اس کے ماضی کا ارتقاء اس کے مستقبل کے ارتقاء کی بنیاد بنتا ہے۔ اس کے باوجود اس کا مستقبل اس کے ماضی سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ کائناتی خودی کی قوتِ ارادی سے پیدا ہوتا ہے۔

۷۔ کائناتی خودی کا مخفی اندرونی مقصد اس کی تخلیق کی آشکار خارجی صورت میں ظہور پذیر ہو رہا ہے اور جوں جوں اس کی تخلیقی فعلیت آگے بڑھتی جا رہی ہے اس کا یہ مخفی اندرونی مقصد بھی زیادہ واضح اور زیادہ آشکار ہوتا جا رہا ہے۔ اور کسی نکتہ رس دیکھنے والے کے لیے یہ بتانا زیادہ آسان ہوتا جا رہا ہے کہ وہ مقصد در حقیقت کیا ہے اور آخر کار خارج میں کس طرح سے ظہور پذیر ہو گا۔

اقبال نے خالق اور مخلوق کی حیثیت سے خدا اور انسان کے باہمی تعلق کو سمجھانے کے لیے ایک انسانی مصوّر اور تصویر کی مثال دی ہے۔ تصویر مصوّر سے کہتی ہے کہ میرے وجود کا دار و مدار تیرے ہنر پر ہے لیکن یہ انصاف نہیں کہ تو میری نظروں سے اوجھل رہے۔

کہا تصویر نے تصویر گر سے
نمائش ہے مری تیرے ہنر سے
ولیکن کس قدر نامنصفی ہے
کہ تو پوشیدہ ہو میری نظر سے

مصوّر جواب دیتا ہے کہ تیرے لیے یہی اچھا ہے کہ تو خبر پر قناعت کرے۔ نظر (یعنی حسن کا ذاتی مشاہدہ اور احساس جسے محبّت یا عشق کہتے ہیں) درد و غم کا باعث ہوتی ہے۔ حقیقتِ انسان و کائنات کا سچّا علم خدا کے عشق کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں جب تک عشق پیدا نہ ہو، قلب روشن نہیں ہوتا اور جہاں بینی کی استعداد حاصل نہیں ہوتی۔ جب تک جگر خون نہ ہو جائے، چشمِ دل میں نظر پیدا نہیں ہوتی۔ گویا نظر کے لیے ضروری ہے محبوب کے عشق میں جلنا اور جل کر مر جانا۔ شرر کو دیکھو کہ وہ محبّت کے سوز سے روشن ہوتا ہے اور اپنے نور سے جہاں کو دیکھتا ہے لیکن اسی جہاں

بینی کی وجہ سے ایک لمحہ میں جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔

گراں ہے چشمِ بینا دیدہ ور پر
جہاں بینی سے کیا گزری شرر پر!
نظر درد و غم و سوز و تب و تاب
تُو اے ناداں قناعت کر خبر پر

لیکن تصویر پھر بھی خبر پر قناعت نہیں کرتی اور مصوّر کو جواب دیتی ہے کہ خبر عقل و خرد کی بے چارگی کے سوا اور کچھ نہیں۔ نظر دل کے لیے حیاتِ جاوداں ہے۔ اس زمانہ کی تگ و دو نے ہر مشکل کو آسان کر دیا ہے، لہٰذا اس زمانہ میں یہ کہنا کہ میں تجھے دیکھ نہیں سکتی ایک ایسا عذر ہے جو وقت کے تقاضوں کے مطابق نہیں۔

خبر، عقل و خرد کی ناتوانی
نظر، دل کی حیاتِ جاودانی
نہیں ہے اس زمانے کی تگ و تاز
سزاوارِ حدیثِ لن ترانی

پھر مصوّر یہ جواب دے کر اس گفتگو کو ختم کر دیتا ہے کہ میرے دیدار کی شرط یہ ہے کہ تو اپنی نظر سے پنہاں نہ ہو۔ چونکہ تو میرے کمالاتِ ہنر میں سے ہے، تیرا اپنے آپ کو دیکھ لینا ہی مجھے دیکھ لینا ہے، لہٰذا مجھ سے ناامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

تو ہے میرے کمالاتِ ہنر سے
نہ ہو نومید اپنے نقش گر سے
مرے دیدار کی ہے اک یہی شرط
کہ تو پنہاں نہ ہو اپنی نظر سے

ظاہر ہے کہ اس نظم میں مصوّر خدا سے اور تصویر انسان سے استعارہ ہے۔ اقبال کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان اپنے آپ کو پہچان لے تو وہ خدا کو پہچان لیتا ہے۔ یہ وہی مضمون ہے جو اقبال نے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے:

ایک حقیقت ہے اور یہ فیصلہ دنیا کے علمی حلقوں میں قبول کر لیا گیا ہے، تاہم اقبال سائنس کے اس فیصلہ کی بنا پر یا رائج الوقت تصوّرات کی کشش کی وجہ سے ارتقاء کا قائل نہیں۔ اقبال کا نظریۂ ارتقا نہ تو متحجّرات (FOSSILS) کی دریافت پر موقوف ہے اور نہ ہی کسی سائنسدان کے نظریۂ ارتقا کی غیر معلوم کڑیوں کی کامیاب جستجو پر مبنی ہے بلکہ اس کا نظریۂ ارتقا۔ خودی کی فطرت اور اس کے اوصاف وخواص کے علم سے ماخوذ ہے۔ یہ حقیقت کہ سائنس بھی اس نظریہ کی تائید کر رہی ہے، اس کی صحت اور صداقت کا مزید ثبوت ہے۔ کیونکہ ضروری ہے کہ ہر سچّی فلسفیانہ حقیقت بشرطیکہ وہ فی الوقع سچی ہو زود یا بدیر سائنس سے بھی تائید مزید حاصل کرے۔

اگر بالفرض سائنس دان کل کو ایسے جدید حقائق سے آشنا ہو جائیں جن کی بنا پر وہ نظریۂ ارتقا سے انکار کرنے پر مجبور ہوں تو پھر بھی اقبال کا یہ نتیجہ کہ ارتقاء ایک حقیقت ہے اور اس کا سبب خالق کائنات کی ربوبیت ہے، اپنی جگہ پر قائم رہے گا اور زود یا بدیر سائنس دانوں کو یہ مان کر اس کی طرف لوٹنا پڑے گا کہ انہوں نے جدید حقائق کا مطلب غلط سمجھا تھا۔ پھر اقبال کے نظریۂ ارتقا میں یہ بات بھی داخل نہیں جیسا کہ ڈارون اور کئی حکمائے ارتقاء نے سمجھا ہے کہ آدمی بندر یا کسی اور نچلے درجہ کے غیر انسانی حیوان کی اولاد ہے، جواب زندہ ہے یا پہلے زندہ رہ چکا ہے۔ اقبال کے نظریۂ ارتقا کے اندر یہ بات مضمر ہے کہ انسان اپنے ارتقاء کی ہر منزل پر انسان ہی سے پیدا ہوا ہے۔ یعنی انسان کی ہر بلند تر حالت انسان ہی کی پست تر حالت سے پیدا ہوئی ہے اور کسی غیر انسانی حیوان سے پیدا نہیں ہوئی۔ اس کی مثال انسانی جنین کی نشوونما ہے۔ ایک فرد کی حیثیت سے انسان ماں کے رحم میں نشوونما پا کر اپنی حالتوں میں سے گزرتا ہے، تاہم انسانی جنین کی ہر حالت انسان ہی کی حالت ہوتی ہے۔ ایک نوع کی حیثیت سے بھی اگرچہ انسان اپنی ترقی کی مختلف حالتوں میں سے گزرتا ہے، تاہم انسانی جنین کی ہر حالت کی طرح ان حالتوں میں سے بھی کسی حالت میں وہ سوائے انسان کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

ماہرینِ حیاتیات کا اعتراف

آج دنیا بھر میں چوٹی کے ماہرینِ حیات (جن میں ایک جولین ہکسلے (JULIAN HUXLEY) ہے، اگرچہ عملِ ارتقاء کی مادّی اور لادینی توجیہہ کرتے ہیں، تاہم وہ اپنے ماہرانہ مشاہدات کی بنا پر

اس نتیجہ سے گریز نہیں کر سکے کہ عمل ارتقاء کا حاصل انسان ہے اور آئندہ کا ارتقاء بھی انسان ہی کے ذریعہ سے ہوگا۔ نظریات اور اقدار کی محبت انسان کا ایسا امتیاز ہے جو کسی حیوان میں موجود نہیں، لہٰذا آئندہ کا ارتقاء نظریاتی ہوگا اور اس بات پر موقوف ہوگا کہ انسان اپنی محبت سے نظریات و اقدار کو کس حد تک مطمئن کرتا ہے۔ علمی ارتقاء کا سب سے اعلیٰ اور عمدہ نتیجہ ترقی یافتہ انسانی شخصیت ہے۔ انسانی ارتقاء نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ ان گہرے معنوں میں بے مثال ہے کہ وہ ایک ہی راستہ ہے جو انسان کی ضروری خصوصیات کو پیدا کر سکتا تھا۔ حیاتیاتی نقطۂ نظر سے یہ ناممکن ہے کہ ارتقائے حیوانات کا کوئی اور راستہ آگے جا کر کسی ایسے حیوان کو پیدا کر سکے جو انسان سے بہتر اور بلند تر ہو۔

جولین ہکسلے (JULIAN HUXLEY) اپنی کتاب "انسان دنیائے جدید میں" (MAN IN THE MODERN WORLD) میں لکھتا ہے:-

"عملِ تخلیق کا سب سے اعلیٰ اور عمدہ نتیجہ ترقی یافتہ انسانی شخصیت ہے۔"

"انسان کے وجود میں آنے کے بعد ارتقاء کی نوعیت یکایک بدل جاتی ہے۔ انسانی شعور کے ساتھ اقدار اور نظریات پہلی دفعہ زمین پر ظہور پذیر ہوئے، لہٰذا مزید ارتقاء کا معیار یہ ہے کہ یہ نظریاتی اقدار کس حد تک مطمئن ہوتی ہیں۔"

"بظاہر حیاتیاتی نقطۂ نظر سے یہ بات ناممکن ہے کہ ارتقائے حیوانات کا کوئی اور راستہ آگے جا کر ایک نئے اعلیٰ اور ارفع جسم حیوانی تک جا پہنچے۔"

"انسانی ارتقاء کا راستہ بھی ایسا ہی بے مثال تھا جیسا کہ اس کا نتیجہ۔ یہ ان معمولی معنوں میں بے مثال نہیں تھا کہ وہ دوسرے تمام حیوانات کے راستوں سے مختلف تھا، بلکہ ان عمیق معنوں میں بے مثال تھا کہ وہ ایک ہی ایسا راستہ تھا جو انسان کی ضروری خصوصیات کو پیدا کر سکتا تھا۔"

اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ ارتقاء کا مقصد صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کو پیدا کر کے اس کی شخصیت کو نقطۂ کمال پر پہنچایا جائے۔ گویا ماہرینِ حیاتیات کے ان نتائج سے بھی حضرتِ انسان کے بارہ میں اقبال کے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ

ضمیرِ کُن فکاں غیر از تو کس نیست نشانِ بے نشاں غیر از تو کس نیست

ڈاکٹر طاہر سعید کے نام (۳)

ڈاکٹر محمد مقصود

اسلام کا معاشی نظام

تفصیلات سے قطع نظر اسلام نے انسانیت کو جو معتدل اور منصفانہ معاشی نظام عطا کیا وہ اس اصولی ہدایت پر مبنی تھا کہ دولت اور سرمایہ جس کی حیثیت جسدِ معاشرہ میں بلاشبہ خون کی سی ہے کسی ایک فرد یا گروہ کے اندر سمٹنے کے بجائے مسلسل گردش میں رہے (الحشر: ۷) اس مقصد کے لیے خالقِ نفسیاتِ انسانی نے نہ صرف یہ کہ معاشیاتِ اسلامی کے ہار میں تقسیمِ دولت اور گردشِ زر کے سچے موتیوں کو خوبی کیساتھ پرو دیا۔ (البقرہ: ۲۷۱، ۲۸۰، ۲۶۷، ۲۶۸، النساء: ۳۰، ۳۶، التوبہ: ۳۴، ۶۰، آل عمران: ۱۸۰ الفاطر: ۲۹، الذاریات: ۱۹) بلکہ تخریب، خیانت اور مفاد پرستی کی ذہنیت پیدا کرنے والے خرف ریزوں کو بھی بڑی عمدگی سے نکال باہر کر دیا۔ (البقرہ: ۱۸۸، ۲۸۳، آل عمران: ۱۶۱، المائدۃ: ۳۸، ۹۰، النساء: ۱۰، النور: ۲، ۱۹، ۳۳، المطففین: ۳)۔ اور یوں اکتنازِ مال کے شجرۂ خبیثہ کی جڑ کاٹ کر سُود جیسے حیوانِ شریر کو نہایت فراست کے ساتھ علی الاعلان ذبح کر دیا اور نہ صرف اس صنم کدے کے برہمنوں اور مجاوروں کے خرقہ، سالوس کو چیر کر انہیں ایک ایسے شخص سے تشبیہہ دی جسے شیطان نے چھو کر پاگل کر دیا ہو (البقرہ: ۲۷۵) بلکہ اللہ کی کتاب نے ایسے ساہوکاروں کو یہ الٹی میٹم بھی دے دیا کہ اگر وہ شجرِ باطل کی اس آبیاری سے باز نہیں آتے تو خدا اور رسولؐ کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ (البقرۃ: ۲۷۹)

اس منصفانہ معاشی نظام پر طاغوت نے کیسے حملہ کیا؟:- اسلام کے اس منصفانہ معاشی نظام سے خدا اور رسولؐ کو خارج کرتے ہی طاغوت نے اس میں سود جیسی لعنت کو مرکزی مقام عطا کیا جیسا کہ بقولِ اقبال ؎

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائیٔ تعمیر میں، رونق میں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بینکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات!

سودی ذہنیت کی یہی وہ بربادی تھی جس کے متعلق قرآن نے جھنجھوڑ کر کہا کہ مالِ حلال کا وہ سیدھا سادہ معاملہ جو تم جیسے عقل کے اندھوں کو الٹا نظر آتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تم اس زعمِ باطل کا شکار ہو چکے ہو کہ اس ظاہری گنتی کے بڑھ جانے سے تمہارا مال بڑھ جاتا ہے حالانکہ یہی ظاہری اضافہ تو وہ حقیقی خسارہ ہے جو مسلسل تمہاری ہلاکت و بربادی کا سامان فراہم کر رہا ہے: وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ (الروم آیت ۳۹) ترجمہ: "اور جو سود تم دیتے ہو کہ لوگوں کے مال میں افزائش ہو حالانکہ خدا کے نزدیک اس میں افزائش نہیں ہوتی" اور یہی سود ہی تو دراصل وہ اندھے کی لکڑی ہے جو ع

"قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے"

کے مصداق انسان کو تنگ دل بنا کر اُسے دوسرے انسان کے حق میں بھوکا بھیڑیا اور خونخوار درندہ بنا دیتا ہے۔ اس حقیقت کی گرہ کشائی اقبال اپنے ایک فارسی شعر میں کس خوش اسلوبی سے کرتا ہے کہ ؎

از ربا جاں تیرہ، دل چوں خشت و سنگ
آدمی درندہ بے دندان و چنگ

ترجمہ: "ربا یعنی سود سے انسان کی روح تاریک اور دل اینٹ پتھر کی طرح

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

بعثت انبیاء و رسل کا اساسی مقصد ———

بعثتِ محمدی کی تمامی و تکمیلی شان ——— نیز

انقلابِ نبوی کا اساسی منہاج ———

ایسے اہم موضوعات پر

——— ڈاکٹر اسرار احمد ———

کی

حد درجہ جامع تصنیف

نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت

کا مطالعہ کیجیے

اشاعتِ خاص (اعلیٰ سفید کاغذ مجلّد) ۲۰/- روپے

اشاعتِ عام (نیوز پرنٹ غیر مجلّد) ۸/- روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴ فون ۸۵۶۰۰۳

NOVEMBER 1989 Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL.8
NO. 11

ماہنامہ میثاق کے ۶۸-۱۹۶۷ء کے اداریوں پر مشتمل

ڈاکٹر اسرار احمد

کی ایک اہم تالیف:

اسلام اور پاکستان

جسے بجا طور پر تحریکِ پاکستان کے تاریخی و سیاسی پس منظر اور اسلامیانِ پاکستان کے تہذیبی و ثقافتی پس منظر پر ایک جامع و مربوط دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔

نیا ایڈیشن، نئی خوبصورت کتابت اور دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

قیمت: اعلیٰ ایڈیشن (مجلد) -/۴۰ روپے اشاعتِ عام: -/۱۵ روپے

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، ۳۶-کے ماڈل ٹاؤن، لاہور